روح کلام غالب

غزلیات غالب کی شعری تشریح

مرتب حواشی
سید افتخار حسین زیدی

مصنف
غالب ثانی مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم

شائع کردہ: نشریات ادب اکیڈمی
بازار نخاسہ سہارن پور یو، پی

اشاعت اول :- سنہ ۱۹۳۵ء ۱۰۰۰

اشاعت دوم :- سنہ ۱۹۶۸ء ۱۱۰۰

قیمت مجلد :- تین روپے

کاتب :- عبدالمنان خوشنویس سہارنپور

زیر اہتمام :- سید عزیز حسن نسیم جلال آبادی

نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند میں چھپی

ناشران

نشریات ادب اکیڈمی بازار نخاسہ سہارنپور

تعارف

مرزا غالب کی تصانیف میں ان کے دیوان اردو کو ہر زمانہ میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی مرزا کا درجۂ سخنوری ہر طرح کی توصیف و تعارف سے بے نیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۸۴۱ء سے اب تک مرزا کے دیوان کے لاتعداد اچھے اور برے، سادہ و پُر کار نسخے شائع ہوتے رہے ہیں، اور یہ سلسلہ یہیں پر بس نہیں ہو جاتا بلکہ شارحین و اہل قلم نے غالبیات کو ایک مخصوص ادبی موضوع بنا لیا ہے۔ مختلف ادبا، اور محققین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کلام غالب کو نئے نئے انداز سے پیش کیا ہے اور آج کلام غالب پر گرانمایہ کتابیں وجود میں آگئی ہیں!

روز روشن کی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ کلام غالب پر جو کتابیں اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں ان میں مولانا حالی کی "یادگار غالب" اور مولانا محمد حسین آزاد کی "آبحیات" کلام غالب کی قدر و منزلت کے عالیشان قصر کی سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا سہانپوری کی شاہکار کتاب "روح کلام غالب" بھی ہے۔

"روح کلام غالب" کے فاضل مصنف نے اس کتاب میں غالب کی تمام غزلوں کی تضمین کچھ اس انداز سے کی ہے جیسے غالب کے کلام کی روح کھینچ کر صفحۂ قرطاس پر منتشر کر دی ہو، یہ کتاب غالب کے کلام کی زبان شعر میں مکمل شرح ہے جس سے غالب کے اشعار کا مفہوم غالب کے ذہن میں کیا تھا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا نے سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ کتاب مکمل کر دی تھی لیکن جس طرح

مرزا غالب اپنی حیات میں خود اپنا دیوان شائع نہ کرا سکے بالکل اسی طرح مرزا سہارنپوری بھی "روح کلام غالب" اپنی حیات میں زیور طبع سے آراستہ نہیں کرا سکے بہرحال کتاب شائع ہونی تھی اور ہوئی مگر مرزا صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۳۵ء میں "روح کلام غالب" زیور طبع سے آراستہ ہوکر کچھ ہی دنوں میں نایاب ہوگئی اور شائقین اسکے مطالعہ کیلئے تڑپتے رہے۔

اب جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم کے وارثان کی کرم فرمائی سے نشریات ادب اکیڈیمی سہارنپور کو اس نادر و نایاب شاہکار کو دوبارہ شائع کرنیکی سعادت نصیب ہوئی۔ ارباب اکیڈیمی جناب مرزا حمید بیگ صاحب حمید اور جناب مرزا سلطان بیگ صاحب وارثان مرزا سہارنپوری کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے شائع کرنیکی اجازت مرحمت فرمائی۔

"روح کلام غالب" میں کچھ دلچسپ اور ضروری حاشیوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ جن اشعار کی مرزا غالب نے خود تشریح کی ہے درج کردیگئی ہے اور اکثر مشکل اشعار کے مطالب بھی تحریر کردیئے گئے اسکے علاوہ ایک ضمیمہ بھی شامل کیا گیا ہے جسمیں مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم کی وہ تضمین جو انھوں نے مولانا جامی، میر وحید لکھنوی اور منشی حسیب الدین سوزاں کے کلام پر کی ہیں اور غیر مطبوعہ بھی ہیں شائع کردی گئی ہیں۔

میں ان ارباب ادب کا نہایت ممنون ہوں جن کی ادبی کاوشوں کے نتیجے ترتیب حواشی میں میرے زیر مطالعہ رہے ہیں ان میں جناب پرتھوی چندر مؤلف "مرقع غالب" کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

سید افتخار حسین زیدی

۱۵ر جنوری ۱۹۶۸ء

مقدمہ طبع دوم

(حکیم مشرف مظاہری سہارنپوری)

غالب کا یہ اپنا خیال نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ ع ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال"
اور اسی بنا پر وہ خلوت کو بھی انجمن سمجھتا اور بنا لیتا ہے لیکن کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی پہلودار خصوصیات اور جدت طراز فطرت کی بدولت بجائے خود ایک انجمن ہوتی ہیں۔ انھیں لوگوں میں غالب بھی ہیں جن کی نظم نما منثور اور گوناگوں کمالات میں محصور شخصیت فردِ واحد کی نہیں بلکہ ایک وسیع ادارے اور قابل قدر اکیڈیمی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسد اللہ خاں غالب کے اشعار الہامی قسم کے ہوں یا ہمالی۔ طرز بیان ہو یا تشبیہات و استعارات۔ قصائد ہوں یا خطوط۔ فلسفہ ہو یا تصوف۔ مذہبی مسائل ہوں یا اخلاقی قدریں سب میں انفرادی شان۔ صحت مند جدت۔ دل کش آن بان اور آزادروی ہے اور بلاشبہ اردو شاعری و نثر نگاری کے طویل و عریض میدان میں ان کا کوئی حریف نہیں ـــــــ عرفان غالب کے سلسلے میں مولانا حالی اور ان کے بعد اکثر قدما اور اصحاب علم نے بہت کچھ لکھا ہے مگر گزشتہ نصف صدی کے دوران جس تسلسل۔ قرینے۔ محنت۔ خلوص اور لگن کے ساتھ کام ہوا ہے وہ کافی حوصلہ افزا اور لائق صد تحسین ہے۔ اور یہ اہم سلسلہ قاضی عبدالودود۔ مولانا امتیاز علی عرشی۔ مولانا غلام رسول مہر۔ آل احمد سرور۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ خواجہ احمد فاروقی۔

مالک رام ایم اے، پروفیسر حمید احمد خاں، مولوی مہیش پرشاد، عبادت بریلوی،
رشید احمد صدیقی، شوکت سبزواری، ظ انصاری، پرتھوی چندر اور کوثر چاند پوری
وغیرہ حضرات کے طفیل جاری و ساری ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف یہ کہ غالبؔ و غالبیات
سے متعلق نہایت اہم سرمایۂ معلومات جمع ہو گیا ہے بلکہ ضمناً شاعری، فلسفۂ حیات
نفسیاتِ انسانی اور فنِ تنقید کے تحت اردو ادب میں معتد بہ افادی مواد کا اضافہ
ہوا ہے اور ان دونوں امور کا ثمرۂ تازہ اور مسرت آگیں پہلو یہ ہے کہ اب دوسری
زبانوں اور دوسرے ممالک کے محققین و اہلِ قلم بھی مطالعۂ غالبؔ اور اردو ادب و
شاعری میں دل چسپی و انہماک سے حصے لے رہے ہیں۔

تضمین کلام غالبؔ:۔ رباعی کی طرح تضمین بھی اپنے تقاضوں کے
لحاظ سے مشکل ترین صنف ہے خصوصاً کسی دوسرے شاعر کے کلام کو تضمین کرنا۔
کیوں کہ اس میں اصلی شعر کے اقدار کو برقرار ہی نہیں رکھنا پڑتا بلکہ کہیں ردیف اور
کہیں ردیف و قافیہ دونوں کا پابند رہ کر ملحقہ مصرعوں میں اس کی توضیح کے ساتھ
مقصودِ کلام کو نئے انداز سے نکھارا جاتا اور بیان کو زیادہ موثر بنانے کے لئے مزید
دلائل و تشبیہات سے وسعت دی جاتی ہے۔ یہ صنف کتنی مشکل ہے اس کا محکم
جواب اور قاطع ثبوت میر مہدی مجروحؔ ایسے قادر الکلام و باصلاحیت شاعر اور
۲ غالبؔ کو تضمین کرنے کا بیڑا اٹھایا لیکن چند گام چلنے کے بعد ہی انھوں نے محسوس
کر لیا کہ اس کوہ کنی میں ع قدم قدم پہ مرحلے نفسِ نفس پہ امتحان" ہیں۔ نیز اس

عرصے میں انھوں نے جو کوشش کی تھی اس کے نتیجے پر جب ناقدانہ نظر ڈالی تو اس کو کسی درجے میں بھی اہم قرار نہ دے سکے اور خیال کیا کہ اگر جگر و تیشۂ فرہاد سے کلام الیکر یہ جوئے شیر مکمل بھی کر لی تب بھی وہ شیریں کے حصول کا ضامنِ کامیابی ذریعہ ثابت نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا یہ سوچ کر کہ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

اس معرکۂ عظیم کو سر کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ اس ناکافی عزم اور شکستِ ہمت کو ہم میر مجروح کی باصلاحیت شخصیت کی تنقیص پر دال نہیں سمجھتے کیونکہ بلاشبہ وہ اس کلام کے اہل بھی تھے۔ ان کا ارادہ نیک بھی تھا اور کلام غالب کی شرح کے لئے ان کی نگاہِ انتخاب نے موزوں ترین راہ بھی اختیار کی تھی مگر قدرت اس کارنامے کا سہرا کسی اور ہی کیلئے مقدر کر چکی تھی اس لئے میر مجروح کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

روحِ کلامِ غالب:۔ میر مجروح کے بعد غالب کے وسیع حلقۂ شاگرداں میں نہ جانے کتنے اصحاب کے دلوں میں اس آرزو نے طوفان بپا کیا ہوگا مگر یہ قرعۂ فال غالب کے پوتا شاگرد (مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا سہارنپوری (تلمیذ حضرت سوزاں) کے نام نکل چکا تھا اور حق یہ ہے کہ انھوں نے بصورتِ احسن یہ حق ادا کیا۔ کلامِ غالب کی تشریح و توضیح میں غالب کے توانا طرزِ فکر اور حسنِ ادا کو ایک چابکدست مصور اور دقیقہ رس فنکار کی حیثیت سے مزید دلآویزی و رنگینی عطا کی اور ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی اردو، فارسی اور ہندی شاعری کی طویل تاریخ اب تک نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے اور جس پر اردو شاعری اور غالب نواز حلقہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف ۔ جس وسیع پیمانے پہ اور بالغ نظری سے غالب و غالبیات پر اہلِ قلم حقِ تنقید و تحقیق ادا کر رہے ہیں اور غالب سے متعلق معمولی سے معمولی واقعے کو منظرِ عام پر لا رہے ہیں اس اعتبار سے یہ امر انتہائی حیرت زا اور باعث افسوس ہے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کی "روح کلام غالب" کو بجائے اسکے کہ اسکی کماحقہ قدر افزائی ہوتی اس کے ساتھ بے اعتنائی و بے نیازی کا وہ مظاہرہ کیا گیا ہے کہ غالبیات کا مطالعہ کرنے والے طبقے میں چند فیصد بھی اس سے واقف نہیں اور اس بے رحمانہ عدم التفات کے طفیل یہ پیکر خوبی ع

آفتاب لیکن اثر سحر ندارد

حرفِ آخر ۔ نظامی صاحب کے مقدمے میں آپ میر مجروحؔ اور صفاؔ صاحب "روح کلام غالب" کی تضمینوں کا موازنہ ملاحظہ فرمائیں گے اسلئے میں اس سے صرف نظر کر کے اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی اور تضمین کا ایک نایاب نمونہ پیش کرتا ہوں۔ یہ تضمین مرزا غالب نے شاہ ظفر کی غزل پر کی ہے جو ۱۰ اپریل ۱۸۵۳ء کے "اردو اخبار دہلی" میں شائع ہوئی تھی اس تضمین سے بخوبی واضح ہو جائیگا کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کی تمام تضمینوں کا معیار و وزن کیا ہے؟ اور کیا "روح کلام غالب" اردو ادب میں مقام رفیع پانے کی مستحق نہیں؟ اور کیا یہ تصنیفِ نادرہ ماضی کی طرح اب بھی گمنامی و بے اعتنائی کی نذر ہو جائے گی۔

غزلِ ظفر "تضمین غالب"

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی　　مر گئے پر قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی

سب ہی پڑھنا کاش ۔ کیوں تکبیر آدھی رہ گئی　　کھینچ کے قاتل جب تری شمشیر آدھی رہ گئی

غم سے جانِ عاشقِ دلگیر آدھی رہ گئی

بیٹھ رہتا لیکے چشمِ پُر نم اس کے روبرو　　کیوں کہا تو نے کہ کہہ دل کا غم اسکے روبرو

بات کرنے میں نکلتا ہے دم اسکے روبرو　　کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اسکے روبرو

ہم نشیں آدھی ہوئی تقریر آدھی رہ گئی

تو نے دیکھا مجھ پہ کیسی بن گئی اے راز دار　　خوابِ بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار

مثلِ زخم آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار　　کھینچتا تھا رات کو میں خواب میں تصویرِ یار

جاگ اٹھا جو کھینچتی تصویر آدھی رہ گئی

غم نے جب گھیرا تو چاہا ہم نے یوں اے دلنواز
مستیٔ چشم سیہ سے چل کے ہوویں چارہ ساز
تو صلائے یاس جاگا تھا جو محو خواب ناز
دیکھتے ہی اے ستمگر تیری چشم نیم باز

کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر آدھی رہ گئی

اس بت مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات
جسکے حسن روز افزوں کی یہ اک ادنےٰ ہے بات
ماہ نو نکلے پہ گزری ہونگی راتیں پانچ سات
اس رخ روشن کے آگے ماہ یک ہفتہ کی رات

تابش خورشید پر تنویر آدھی رہ گئی

تا مجھے پہنچائے کاہش بخت بد کی گھات میں
ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں
جز غم و رنج و الم گھاٹا ہے ہر اک بات میں
کم نصیبی اسکو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں

آتے ہی خاصیت اکسیر آدھی رہ گئی

سب یہ گوشہ کنارے ہیں گلے لگ جا مرے
آدمی کو کیوں پکارے ہے گلے لگ جا مرے
سر سے گر چادر اتارے ہے گلے لگ جا مرے
مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے گلے لگ جا مرے

وصل کی شب اے بت بے پیر آدھی رہ گئی

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے یوں پھر گئے　　پر نصیب اپنا انھیں جاتا سنا جوں پھر گئے

دیکھنا قسمت وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے　　آکے آدھی دور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے

کیا کشش ہے دل کی اب تصویر آدھی رہ گئی

ناگہاں یاد آگئی ہے مجھکو یا رب کب کی بات　　کچھ نہیں کہتا کسی سے سن رہا ہوں سب کی بات

کسلئے تجھ سے چھپاؤں ہاں وہ پرسوں شب کی بات　　نامہ بر جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات

خط میں آدھی ہو سکی تحریر آدھی رہ گئی

ہو تجلی برق کی صورت میں ہے یہ بھی غضب　　ہاں جو چھ گھنٹے کی ہوتی فرصت عیش و طرب

شام سے آتے تو کیا اچھی گزرتی رات سب　　پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب

نکلی آدھی حسرت اے تقدیر آدھی رہ گئی

تم جو فرماتے ہو۔ دیکھ اے غالب آشفتہ سر　　ہم نہ تجھکو منع کرتے تھے گیا کیوں اسکے گھر؟

جان کی پاؤں اماں۔ باتیں سب سچ ہیں مگر　　دل نے کی ساری خرابی۔ لیگیا مجھ کو ظفر

واں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی

محبِ مکرم جناب سید افتخار حسین صاحب زیدی ناظم نشریات ادب اکیڈیمی اور سید عزیز حسن نسیم مدیر دیرہ وحرم سہارنپور لائقِ صد مبارکباد ہیں کہ اس دور ابتلا و گرانی میں روح کلام غالب کو حیاتِ نو سے بہرہ ور کرنے اور علم دوست اصحاب تک پہونچانے کے نیک جذبے سے اس کی طبع دوم کے لئے کمر ہمت باندھی۔ ع

"خدا نصیب کرے انکو عشرتِ منزل"

آمین

مقدمہ

(از مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی)

میرے دوست مرزا احمد ظفر بیگ صاحب جن کے حسن سعی سے "روح کلام غالب" طبع ہو کر آج شائقین کے پیش نظر ہے۔ مجھ سے مصر ہوئے کہ میں اس کا مقدمہ لکھوں غالباً ان کا یہ اصرار اس بنا پر تھا کہ مجھے کلام غالب سے دلی لگاؤ رہا ہے اور اس کے فدائی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میری گوناگوں مصروفیتیں کچھ عرصہ تک مرزا صاحب کی تعمیل ارشاد میں مانع رہیں۔ جب تقاضا حد سے بڑھا تو کچھ وقت اس کے لئے بھی نکالا۔ میں نے اس مقدمہ میں اختصار کو مدنظر رکھا ہے تاکہ ناظرین آسانی سے اس کے مطالعہ کے لئے وقت دے سکیں ورنہ کلام غالب کا موضوع اس قدر دلچسپ اور وسیع ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

غالب غزل کا بادشاہ تھا اس نے اس صنف سخن کی ماہیت کو خوب سمجھا ہے۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہے کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخلی ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہویدا ہو سکے اور اس کی وسعت ادراک کا پتہ چل سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ جملہ اصناف سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار ہے اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوستان نظم کا ایسا قطعہ کہنا چاہیئے جسکی روشیں

۱؎ نواب مسعود جنگ سر راس مسعود صاحب بی۔ اے آکسن کی تحریک سے سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں میں نے اردو دیوان غالب معریٰ اشارات املائی کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے (باقی آئندہ)

غیر مسلسل اور نامربوط ہونے کے باوجود بے حد دلکش اور روح افزا ہیں۔ جس طرح آسمان پر چھٹکے ہوئے تاروں کی بے ترتیبی ان کی نور آفرینیوں کو جِلا دے دیتی ہے اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر اشعار اس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور یا ایں ہمہ نامربوطی و بے نظمی "کُلُّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ" کا مصداق بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شعر نئی تخئیل کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخئیل میں نئی نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں۔ کہیں فلسفۂ اخلاق و تصوف کے گوناگوں رموز عالم حیرت و استعجاب طاری کر دیتے ہیں تو کہیں جذبات حسن و محبت کی بوقلمونی مسحور ویے خود بنا دیتی ہے۔ غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک پڑھ جایئے اس کا ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اترے گا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا کلام جب پڑھئے نیا لطف آتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام میں اکثر اشعار شرح طلب ہیں۔ اسی لئے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی موشگافیاں کی گئی ہیں یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے کہ یہ شروح و حواشی اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ غالب کے سوا ریاں اردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعراء کے مدمقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ بست سال زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو جس بلند آہنگی کے ساتھ سراہا گیا ہے اور اس کی مدحت طرازی کی گئی ہے اس کے ثبوت کے لئے

گزشتہ سے پیوستہ۔ شائع کیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں سلسلۂ آصفیہ کی پہلی کڑی کے طور پر شروح ایڈیشن شائع ہوا۔ میری یہ شرح تعلیم یافتہ طبقہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے ہیں۔ (نظامی)

ان ضخیم شرحوں کے علاوہ ملک کے نامور مصور چغتائی کا دیدہ زیب "مرقع" اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں۔

کلام غالب کی قدر و منزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے انیسویں صدی کے آخر میں "یادگار غالب" لکھ کر رکھا تھا آج "روح کلام غالب" کی اشاعت سے پایۂ تکمیل کو پہونچ رہی ہے کسی شاعر کے لئے یہ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعراء اس کی دو چار چیدہ غزلوں کے اشعار پر مصرعہ لگائیں اور ان کی تضمین کر کے اپنے کلام میں شامل کریں لیکن اردو کیا فارسی میں بھی کوئی مشہور سا مشہور شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان ہی کی تضمین کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدر افزائی میں یہ ہی ایک کمی تھی، جس کو "روح کلام غالب" (جو غالب کی تمام غزلوں کی تضمین ہے) بدرجہا تم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کیا جانا چاہیئے۔

اردو ادب میں تضمین کا رواج دراصل فارسی کا اتباع ہے اردو میں فارسی غزلوں کی بھی تضمین کی جاتی ہے اکثر شعراء خود اپنی غزل کی بھی تضمین کرتے ہیں۔ یہ تضمین دو قسم کی ہوتی ہے مثلث اور مخمس۔ مثلث میں اول مصرعہ تضمین کا ہوتا ہے اور دو مصرعہ اصل غزل کے جس کی تضمین کی جائے۔ مخمس پانچ مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تضمین کے ہوتے ہیں اور دو اصل غزل کے۔ اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف (روح کلام غالب) نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعہ اپنے چسپاں کئے ہیں۔

تضمین کی صرف یہ ہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے دست

گریاں ہوجاتیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور لاینحل ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے کہ پوری تضمین ایک ہی دل و دماغ کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تضمین کی گئی ہے اس لئے اگر کہیں کہیں یکساں زور قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو الشاذ کالمعدوم کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تضمین کرنے میں اپنی پوری قوت شاعری صرف کرکے کلام غالب کی شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ مشکل ترین اشعار کے معانی اور مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام شرحوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ غالب کے جن مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شارحین نے نثر میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے ہیں ان کو مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔ ع

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

غالباً اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب اور مرزا صاحب مرحوم دونوں فطری شاعر تھے۔ مرزا مرحوم خود بھی ایک دردمند دل رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو درد غالب کے کلام میں ہے اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی خواجہ حافظ نے خوب فرمایا ہے ؎

نالِ بلبل اگر با منت سر یاریست　　کہ ما دو عاشقِ زاریم وکارِ ما زاریست

جب دو دردرسیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی داستانِ غم سناتا ہے تو سننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہے یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پیدا ہوتی ہے فرماتے ہیں:۔

ذرا اس بے زباں دل کی صدا سُن　　کچھ اپنی قدر دانی کا گلا سُن
یہ لعلِ بے بہا کہتا ہے کیا سُن　　سن اے غارت گرِ جنس وفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اس ایسی آرزو پر مرمٹا ہوں　　کہ نصب العینِ چشم سرمہ سا ہوں
ہمہ تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں　　نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافلہائے تمکیں آزما کیا

ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب　　اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب
مجھے امیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب　　بہ جی ستا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

کیا خوب شرح کی ہے ؎

جنوں مانع ہوا استاد کا احساں اٹھانے سے　　فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے
رہا انکار عقلِ کل کو غیر لا بتانے سے　　فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

ایک مقطع کی تضمین ملاحظہ ہو جس میں غالب نے بوڑھاپے کا رونا رویا ہے ؎

کہیے مرزا کا حال کیا غالب | بے طرح ضعف ہوگیا غالب
ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالب | مضمحل ہوگئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غالب کے ایک شعر کی جس میں توحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے تضمین کے تین مصرعوں میں ایسی شرح کی گئی ہے جس سے شاعر کا مافی الضمیر صاف سمجھ میں آجاتا ہے لکھتے ہیں ا-

ہیں موحد بخدا شرک ہی دل سے مفقود | ہم معبد ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود
روبقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہی مقصود | ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالب نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کرکے عاشق کی خوش نصیبی انوکھے طرز سے ثابت کی ہے جس میں زلفوں کی پریشانی کو شب وصال میں لطف کا سبب ظاہر کیا ہے اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت فرمائی گئی ہے تضمین نگار نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں کہتے ہیں۔

بزم میں جو ہمنشیں تیرا ہو راتیں اسکی ہیں | صبح نظارہ میں کر دیتا ہے راتیں اسکی ہیں
اس کو بھی وہ خوش نصیب کہئے ہو راتیں اسکی ہیں | نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

ایک شرح طلب شعر کی منظوم شرح ذیل کی تضمین میں ملاحظہ ہو:-

ہنسی یاروں نے کیا کی اک نصیحت مجھکو فرمائی | نہ اب وہ جوش وحشت ہے نہ فرط ناشکیبائی
سکوں سا ہوگیا دلکو گیا سامان رسوائی | نکوہش مانع بے ربطی شور جنوں آئی

ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

جب غالبؔ دہلی سے لکھنؤ کے سفر کے لئے اس امید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے کچھ امداد لے کر نجف اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک غزل لکھ کر ان جذبات کا اظہار کیا اس غزل کے دو شعروں کی تضمین قابل ملاحظہ ہے کس خوبی سے واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔

عقل حیران ہے کس وجہ سے چھوڑی دہلی | کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی
یک بیک چھوڑ دی کیوں الفت راحت گھر کی | لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھی دل میں یہاں کی سی لہر | بیٹھ رہنا ہمیں اور ترک سفر ہے اک قہر
قصد ہے دور کا مانع جو نہ ہو گردش دہر | مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر

عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے اور یہ ان کی فہم کا قصور ہے۔ اس مطلب کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو۔ کیا خوب کہا ہے۔

میری سخنوری پہ عبث قیل و قال ہے | مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب کچھ اور زباں میری لال ہے | گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے بھی شعر ہیں جو سہل ممتنع کا حکم رکھتے ہیں ایسی غزل کے ایک شعر کی تضمیں نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو جس میں

تضمین کی زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہے۔

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے ۔۔۔ حاصلِ گریۂ و بکا کیا ہے
اس تڑپنے سے مدعا کیا ہے ۔۔۔ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تضمین کے نمونے پیش کر دیئے ہیں تاکہ ناظرین "روح کلام غالب" کی خوبیوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم ہو سکے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو مخمس بناکر وسعت دینے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے اور غالب کی اس آرزو کو کہ ان کے بیاں کی وسعت کے لئے تنگنائے غزل سے زیادہ وسیع میداں درکار ہے کس حد تک پورا کیا غالب کے اسی مضمون کے شعر کی تضمین میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے فرماتے ہیں:۔

سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرزِ عمل ۔۔۔ کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل
نہ کیوں ہو حدِ تغزل میں رشک کے جی بیکل ۔۔۔ بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مرزا مرحوم کی تضمین کے متعلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے شاعروں نے جو غالب کی بعض غزلوں کے خمسے کئے ہیں ان کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی تضمین کا کیا درجہ ہے مثال کے طور پر میر مہدی مجروح دہلوی کے خمسوں کو جو غالب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے خمسوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں۔ مبصر اور ناقدانِ کو پڑھ کر خود رائے قائم کریں:۔

مجروح

کام نخوت سے کچھ روا نہ ہوا
درِ حاجت کسی پہ وا نہ ہوا
کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا
دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہو

دے خدا رحم ان حبیبوں کو
کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو
رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

کبھوں عبث جا کے اپنا سر ٹکرائیں
ناحق احسان کیوں کسی کا اٹھائیں
اس سے جب آرزوئے دل ہی نہ پائیں
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

رکھنا لذت جو ہے دہانِ حبیب
شہد مصری کو وہ کہاں ہے نصیب
کیا کہوں بات ہے عجیب و غریب

مرزا

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا
کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
مجھ پر احساں طبیب کا نہ ہوا
دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

ہو گئے رسوا تمھیں کہا مانو
بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اور تجھ سا حسیں کہاں سے لائیں
حسرت دل کی داد کس سے پائیں
کس کے ہاتھوں سے زخمِ دل پر کھائیں
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

سخن تلخ کب ہے ان کے قریب
ان سے باتیں سنے یہ کس کے نصیب
ہے حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب

مجروح

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
فکر کی قسمت آزمانے کی
یعنی اس شوخ کو بلانے کی
یہ سنو بات دل جلانے کی
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جب سے عقل و تمیز آئی تھی
تیرے ہی در پہ جبہ سائی تھی
دم بدم عاجزی فزائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
اس کی بخشش نے کی ذرا نہ کمی
کچھ تلافی پہ ہم سے ہو نہ سکی
کیا بڑی بات ہم نے کی ایسی
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
ان کے جب بحر فکر بہتے ہیں

مرزا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
جب ہمیں دھن تھی ان کے لانے کی
استطاعت تھی گھر سجانے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان طاعت ہی میں کھپائی تھی
کچھ خودی تھی نہ خودنمائی تھی
سر تھا سجدہ تھا جبہ سائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
قابل فخر کیا ہے بات اپنی
عین احساں ہے اس کی خوشنودی
ہم نے اس پر نثار کیا تن کی
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
مثل مرزا مصر وہ رہتے ہیں

مجروح

ہم تو مجروح غرق رہتے ہیں
آپ کیوں طعن طنز سہتے ہیں
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

ایضاً

لا تقنطو نوید ہے ام الکتاب میں
زاہد گناہِ خلق ہیں وہاں کس حساب میں
ہے عرض یہ جنابِ تقدس مآب میں
کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

گو آرزوئے دید میں بے قرار ہوں
ہرگز وہ یاں نہ آئیں گے میں کو طلب کروں
پر کچھ تو شغل چاہیئے بیکار کیوں رہوں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھینگے جواب میں
شادی و غم کو عشق میں اک ارتباط[۱] ہے

مرزا

جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹ بہتے ہیں
سب غم انتظار سہتے ہیں
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

ایضاً

جامِ سبو کو رکھو نہ بچا کر سحاب میں
شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں
وہاں کچھ کمی نہیں کہ ہو تو اضطراب میں
کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

لکھو تم دینا انھیں کہ مرا حال ہے زبوں
ہے ان سے آرزوئے تسلی نرا جنوں
آگاہ انکی عادتِ خصلت سے خوب ہوں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
وہ آج میرے گھر چلے آئے مست سے

---

[۱] ارتباط کی ط کو ت سے بدل کر اس کو مت۔ واردات اور بات کا ہم قافیہ کرنا صریحی غلطی ہے
معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی ہے۔

مجروح

اس میں کبھی حیات ہے گاہے ممات ہے
ہے طرفہ حال اور نئی واردات ہے
میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

حکمِ خدا میں گو لبِ چون و چرا ہے بند
مالک ہے وہ حقیر کرے خواہ سربلند
پر دل تو اس خیال سے رہتا ہے فکرمند
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

ہمدرد! قہر ہے بتِ خانہ خراب کے
اوسان کھو دیئے دلِ بے صبر و تاب کے
آثار ہم سمجھ گئے ان کے عتاب کے
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

اہلِ نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود
ہے اس کی ذات پاک سے ہر چیز کی نمود
ہر ایک کو نہیں خبرِ نیستی و بود
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

مرزا

شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طے
جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے
میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند
ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خوار و مستمند
پہونچا رہا ہے ہر متنفس ہمیں گزند
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے
لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے
آثار بات بات میں ہیں پیچ و تاب کے
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

اشیا کی ہے تصورِ اشیا سے سب نمود
دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب وجود
ہستی کے واہمے کی بدولت ہی ہست و بود
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

مجروح

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

میں واکہ جہاں سے اپنی فدا اس پہ ہوں مگر
میری اذیتوں سے خوشی ہے وہ فتنہ گر
ہے بار میرا دشمن آرام کس قدر
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

رکھتے ہیں گو نہاں وہ جمال نظارہ سوز
سامان زیب رہتا فراہم مگر ہے روز
نکھر سکے ہے تا درست رہے روئے دلفروز
آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

تا ہو نہ اس کو میرے اٹھانے میں اہتمام
محفل میں اس کی ہم نے نہ رکھا کسی سے کام
یاں توسنِ خیال میں رکھا سدا مقام
مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

گر شوخیاں جتا کے ملانا نگاہ کا
گر شرمناک ہو کے چھپانا نگاہ کا

مرزا

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کیا کہئے، ہوتی تھی شب غم کس طرح بسر
اختر شماریوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر
توڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز
نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
ہے محو ناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز
آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں ان سے خاص و عام
اٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز تشنہ کام
بیٹھے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام
مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

آتا ہے یوں تو ان کو لڑانا نگاہ کا
نظریں بچا کے سب کی ملانا نگاہ کا

مجروح

اندازِ دلبری سے جھکانا نگاہ کا
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جب تک کہ پھر خاص مقدر ہی کا نہ جائے
بنتا نہیں ہے کام کوئی لاکھ گر بنائے
اس بات کا یقین کوئی کس طرح سے لائے
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

مقدور زنگ تو سخی میں یاں دست پا ہلائے
پر کیا کریں مراد ہی جب کوئی بر نہ آئے
یہ حال ہو تو خاک محبت کا لطف آئے
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

ملکِ عدم کے دیکھیے عازم یہ کیا بنے
اس رہ میں ڈر بہت ہیں نشیب و فراز کے
پر جس میں بس ہی اپنا نہ ہو اس میں کیا کرے
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مرزا

آفت ہے اف مگر نہ اٹھانا نگاہ کا
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اسکو عمل میں لائے
مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

وہ نالہ جو کہ عرشِ معلیٰ کو بھی ہلائے
وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
وہ نالہ اور کان تک اس تندخو کے نجائے
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے
لبسا نہیں عدم سے ادھر دم کہیں اسے
بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مرزا	مجروح
تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی	مجروح کو اس امر سے ہے خوب آگہی
دیکھا نہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی	اب وہ نہیں ہے بادہ پرستی جو پہلے تھی
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی	بالکل ہی ترک مے ہو یہ ممکن نہیں ابھی
غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی	غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں	پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

نوٹ:۔ جس مصنف کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اس کے حالات زندگی کا جاننا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوتا۔ مرزا محمد ظفر بیگ سے جو مصنف مرحوم کے عم زاد برادر ہیں مرزا کے ذاتی اور خاندانی صحیح حالات بہم پہونچائے ہیں۔ حالات بطور ضمیمہ آمدہ صفحات میں پڑھیں۔

خاکسار نظامی بدایونی

۴ مارچ ۱۹۳۵ء

حالات مصنف

(از مرزا ظفر بیگ صاحب سہارنپوری)

خاندانی حالات

آپ کے جد امجد مرزا مختیار مرحوم حیثائی مقام تیمو علاقہ روسی ترکستان کے قدیم باشندے تھے چھٹی پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب مرزا فریدوں بیگ قاسی سے جو حضرت امیر تیمور صاحب قران گورگانی کے زانوئے جلیس تھے ملتا ہے۔ مرزا مختیار مرحوم اٹھارہویں صدی کے آخری دور میں اپنے چند خاندانی جھگڑوں سے پریشان ہو کر دہلی تشریف لائے اس زمانہ میں دہلی میں شاہ عالم بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ ملک میں ہر طرف قتل و غارت۔ مرہٹوں کا زور تھا اور حکومت بھی ہر طرف برائے نام تھی۔ مرزا مختیار مرحوم شاہ عالم کے حضور میں پیش ہوئے۔ شاہ عالم نے مرزا مرحوم کے خاندانی حالات کی بنا پر بہت قدردانی فرمائی اور ان کو اپنی خدمت میں معتمد خاص کے عہدہ پر سرفراز فرمایا۔ لیکن مرزا چونکہ فن سپاہ گری میں کمال دستگاہ رکھتے تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے بعد مرزا مرحوم کو فوجی محکمہ میں کسی معزز عہدہ پر تقرر کر دیا گیا۔ مرزا مرحوم نے اپنی حسن لیاقت سے تھوڑے ہی عرصہ میں سپہ سالاری کا درجہ حاصل کر لیا۔ مرزا مرحوم کی اس ترقی کے باعث ایک مرہٹہ فوجی افسر کو رشک پیدا ہو گیا اور دونوں کے باہم چشمک ہو گئی۔

اتفاقاً ایک روز مرزا مرحوم اور مرہٹہ سردار میں کچھ لفظی تکرار ہوگئی جس کی وجہ سے مرزا مرحوم کو اس قدر طیش آیا کہ فوراً تلوار نکال کر مرہٹہ سردار کا کام تمام کر دیا۔ مرہٹہ سردار کے قتل ہونے سے تمام مرہٹی فوج میں ہیجان پیدا ہوگیا اور وہ سب کے سب مرزا مرحوم کے قتل کے درپے ہوگئے۔ تندہ شدہ یہ معاملہ شاہ عالم بادشاہ کے روبرو پیش ہوا۔ مرہٹی فوج کے سرداروں نے مرزا کی شکایت کے دفتر کھول دیئے شاہ عالم بادشاہ نے مرہٹوں کے غصہ کو فرو کرنے کی غرض سے دفع الوقتی کے لئے مرزا مرحوم کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور اصل معاملہ کا فیصلہ کسی دوسرے وقت پر ملتوی فرمایا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی نیت یہ تھی کہ مرزا مرحوم کو کسی حیلہ سے ان کے وطن پہونچا دیا جائے۔ مرزا مرحوم ایام نظر بندی میں تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے تھے اسی حالت میں تین ماہ کے بعد ایک روز علی الصبح نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دفعتہً کلیجہ میں درد پیدا ہوا اور دو تین گھنٹہ کے بعد مرزا مرحوم نے شاہی قید ہی سے نہیں بلکہ قید حیات سے بھی نجات پائی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط۔ مرزا مرحوم کی وفات پر ان کا تمام اثاث البیت ضبط کر لیا گیا۔ مرزا مرحوم کی اہلیہ محترمہ اپنے دو صغیر سن بچوں کریم مرزا اور رحیم مرزا کو لیکر سہارنپور تشریف لے آئیں چونکہ مرزا مرحوم کی اہلیہ نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اس لئے اہالیان سہارنپور نے ان کی نہایت عزت کی اور انھوں نے ایک زنانہ مدرسہ قائم کیا جس میں علاوہ قرآن پاک کی تعلیم کے دیگر اخلاقی کتب ہائے فارسی کی بھی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ بہت عرصہ تک سہارنپور میں جاری رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد کریم مرزا اور رحیم مرزا بھی اپنی مکتبی تعلیم سے فارغ ہوکر جوان ہوئے۔ کریم مرزا محکمہ پولیس میں اور رحیم مرزا تحصیل سہارنپور میں نائب ناظر

مقرر ہوئے۔ رحیم مرزا بیس سال کی عمر میں پانچ سال ملازمت کرنے کے بعد دفعتہ بعارضہ
ہیضہ ۱۸۴۵ء میں لاولد فوت ہوئے۔ کریم مرزا نے محکمہ پولیس میں خاطر خواہ ترقی کی
اور بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور فتحپور اور بلند شہر میں معزز عہدوں پر کام کیا ۱۸۵۶ء
میں بلند شہر سے چھ ماہ کی رخصت لیکر تشریف لائے اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال
سہارنپور میں ہو گیا۔ آپ نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی
سب سے بڑے صاحبزادے مرزا محمد شفیع بیگ تھے جو عرصہ دراز تک ضلع سہارنپور کے
مختلف تھانوں میں کوتوال رہے ایام ملازمت میں تین حج کئے اور ۱۸۷۲ء میں تھانہ داری
کے عہدہ سے پنشن پائی اور چھ سال تک پنشن پاکر ۱۸۷۸ء میں انتقال فرمایا۔ مرزا
حکیم بیگ صاحب منجھلے صاحبزادے تھے آپ نے ۱۸۶۴ء میں امتحان مختارکاری پاس
کیا آپ کا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر رہا اور بہت بڑے کامیاب مختارکار ثابت ہوئے
حکام ضلع آپ کی خاص طور پر عزت کرتے تھے آپ کا انتقال ۱۸۹۱ء میں ہوا۔ آپ
نے اپنی وفات کے بعد کافی جائداد زرعی و سکنی چھوڑی جو اب تک آپ کے بیٹوں کے
کے پاس موجود ہے۔ مرزا وزیر بیگ صاحب سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ
۱۸۷۱ء میں محکمہ پولیس میں ملازم ہوئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں ترقی پاکر تھانہ دار
کے عہدہ پر پہونچے تھے۔ بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور میں مختلف مقامات پر تھانہ دار
رہے۔ آپ نہایت قوی اور جسیم تھے اب تک ضلع سہارنپور میں آپ کی طاقت کے کرشمے
بیان کئے جاتے ہیں آپ نے ۱۹۰۳ء میں انتقال فرمایا۔

مرزا عزیز بیگ کی تاریخ پیدائش

مرزا عزیز بیگ صاحب مرحوم المتخلص
بہ مرزا سہارنپوری مرزا وزیر بیگ

صاحب مرحوم کے خلف الرشید تھے۔ آپ ۱۸۶۵ء میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئے۔

تعلیم تلمذ قرآن پاک وغیرہ کی تعلیم ختم ہونے پر آپ منشی مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم المتخلص بہ سوزاں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے منشی صاحب فن شاعری میں حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے خاص شاگرد تھے۔ ایک مدت دراز تک غالب مرحوم کی خدمت میں دہلی رہے۔ اور غالب مرحوم کے انتقال پر سہارنپور تشریف لائے جیسا کہ سوزاں صاحب مرحوم نے ایک غزل کے مقطع میں فرمایا ہے ؎

غالب سے کام تھا سو وہ سوزاں گزر گئے

دہلی میں اب جناب کا کیا کام رہ گیا

مرزا عزیز بیگ صاحب کو اوائل عمری سے ہی شعر و سخن میں خاصی دلچسپی تھی اس پر قابل استاد کی توجہ ذہن کی رسائی تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی اور اردو کی غزلیں تصنیف فرمانے لگے۔ منشی صاحب مرحوم اپنے ہونہار شاگرد کی تیزی طبع دیکھ کر انکی تعلیم میں بے حد کوشش فرماتے تھے۔ چند ہی سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ آپ کو فارسی زبان میں کامل دستگاہ تھی۔ عربی میں بھی خاصی لیاقت پیدا کر لی۔

شاعری مرزا مرحوم ایک اعلیٰ ادیب اور شاعر تھے آپ ایک ایسے مخصوص رنگ کے مالک تھے جو اکثر ان کے ہمعصر شعراء کی ابتدائی روش سے قطعاً جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی شاعری آپ کی استادانہ حیثیت کی بیّن دلیل ہے ضلع سہارنپور اور دیگر اضلاع میں آپ کے بہت شاگرد موجود ہیں۔ آپ کا طریق اصلاح قابل تحسین تھا۔ اپنے ہر شاگرد کے کلام میں اس کے مذاق اور علم کے موافق ایسی اصلاح فرماتے تھے

کہ جس کا جواب مشکل ہے۔ ۱۹۱۸ء میں چند احباب کے اصرار سے حضرت مرزا غالب مرحوم ومغفور کے دیوان کی تضمین لکھنی شروع کی۔ ماہ اپریل ۱۹۲۰ء میں اس اہم کام کو بحسن وجوہ اتمام کو پہونچایا اسی عرصہ میں آپ کو درد قولنج کا دورہ پڑنے لگا اور اسی مرض میں چھ ماہ بعد ماہ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے اخیر ہفتہ میں ۵۵ سال چھ ماہ کی عمر میں رحلت فرمائی۔ تاریخ وصال ؎۔ روح مرزا بہشت میں پہونچی انا للہ وانا علیہ راجعون آپ نے اپنی وفات پر دو لڑکیاں چھوڑیں۔

ذریعہ معاش وطرز معاشرت

آپ نے ۱۸۸۵ء میں امتحان مختار کاری پاس کیا مگر شعر وسخن کا اس درجہ شوق تھا کہ کچہری کے کاروبار کو محض ضرورتاً انجام دیا کرتے تھے اور ہفتہ میں صرف ایک دو مرتبہ کچہری تشریف لے جاتے اور جو کچھ وہاں سے یافت ہوتی اس کو اپنے صرف میں لاتے۔ جب تک وہ روپیہ صرف نہ ہو جاتا اس وقت تک کچہری تشریف نہ لے جاتے۔ آپ کی قانونی قابلیت بھی قابل تعریف تھی۔ اکثر طلبا آپ سے قانون بھی پڑھتے تھے۔

شادی

مرزا کی شادی ۱۸۹۲ء میں آپ کے عم اکبر مرزا حکیم بیگ صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی علاوہ قرآنی تعلیم کے اردو اور فارسی میں کافی لیاقت رکھتی تھیں۔ امور خانہ داری اور حسن انتظام میں لائق تعریف تھیں اس وجہ سے شہر کے معزز رؤسا وغیرہ کی لڑکیاں بغرض حصول علم ان کے پاس آتیں۔ آپ کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا مرزا مرحوم اس حادثہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جلسہ شعر وسخن اور دیگر دنیوی مشاغل کو ترک کر دیا۔ ہر چند

اعزا و اقربا نے مرزا مرحوم کی توجہ عقد ثانی کی طرف دلائی مگر مرزا مرحوم نے ایک نہ سنی اور آخر دم تک اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے اس زمانہ میں ایک نہایت پر درد غزل لکھی تھی جس کے مطلع سے دلی حزن و ملال کا اندازہ ہو سکتا ہے شعر

یاد ہیں وہ دن کہ ہم تھے اور زمانے کے مزے
یاد آتے ہیں قفس میں آشیانے کے مزے

مذہب مرزا مرحوم بہ اعتبار مذہب نہایت وسیع الخیال تھے۔ اعتقاداً مذہب حنفی کے پیرو اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ اگرچہ آپ کے پاس بسا اوقات مختلف مذاہب کے اشخاص کا مجمع رہتا تھا مگر آج تک کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی صاحب کے مذہبی معاملات پر بحث یا گفتگو مرزا مرحوم نے کی ہو یا دوسرے مذاہب پر کبھی نقیضانہ زبان طعن کھولی ہو۔ ابتداءً مرزا کو اپنے اور شوقین طبع دوستوں کے اصرار پر محض رقص و سرود میں شریک ہونے سے احتراز نہ تھا مگر یہ سلسلہ سنہ ۱۹۰۴ء میں بالکل ترک کر دیا تھا اور سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا الحاج مولوی خلیل احمد صاحب مہاجر مکی مدرس اول مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے بیعت کی چنانچہ اس واقعہ کو مرزا مرحوم نے اپنی ایک نعتیہ غزل کے مقطع میں اس طرح پر واضح کیا ہے۔ شعر

بہت کچھ صحبت رنداں میں کھویا وقت اے مرزاؔ
بس اب تو کچھ دنوں خدمت کرو اللہ والوں کی

اخلاق آپ کا اخلاق نہایت وسیع تھا ہر خاص و عام سے نہایت خندہ

پیشانی اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ آپ کی نشست گاہ میں احباب اور تلامذہ کا جلسہ رہتا تھا مگر ان کے جلسے میں کبھی کسی کی یہ مجال نہ ہوتی تھی کہ کسی کی غیبت یا بدگوئی کرے۔ آپ نہایت کم سخن اور متین تھے بلاضرورت کسی سے زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔

فہرست غزلیات تضمین شدہ

۱

کیا یہ فنا نقشا ازل ہیں کاتب تقدیر کا ۔۔۔ ذرہ ذرہ ہو فنا اک روز اس تعمیر کا
رنگ جھلکا یا ہے کیوں ہر چیز میں تغیر کا ۔۔۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا[1]
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

درد و غم کرتے ہیں جو کچھ روح فرسائی نہ پوچھ ۔۔۔ حسرتیں کرتی ہیں جو ہنگامہ آرائی نہ پوچھ
توڑتی ہے دل کو کیونکر ناشکیبائی نہ پوچھ ۔۔۔ کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آرزوئے قتل کو لب پر نہ لانا چاہیئے ۔۔۔ ہاں مگر در پردہ تدبیر و تقاضا چاہیئے
کھینچ کر خود آئے اثر قاتل پر اتنا چاہیئے ۔۔۔ جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

کوئی کم مایہ اگر برسوں طبیعت کو لڑائے ۔۔۔ غیر ممکن ہے کوئی نکتہ مرے نکتوں سے پائے

---

[1] بعض شارحین نے اس شعر کو بے معنی قرار دیا ہے حالانکہ ایسا کہنا سراسر بے انصافی ہے مرزا غالب نے عبدالرزاق شاکر کو اس شعر کی تشریح یوں لکھ کر بھیجی ہے :۔ کہ "ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلایا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اور اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہے موجب رنج و ملال و آزار ہے۔"

لاکھ سامع کان اپنے میری باتوں پہ جمائے — آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

جوشِ وحشت جب مجھے تھمنے نہیں دیتا ذرا — پھر ہے مرزا سلسلہ بیکار قید و بند کا

ہیں مرے نزدیک طوق و رسن تو چیز کیا — بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

۲

کیا بتاؤں آتشِ الفت میں کیا کیا جل گیا — ساز و ساماں اپنی ہستی کا سراپا جل گیا

جسم بالکل پھنک گیا ہے اور کلیجا جل گیا — دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

مجھ کو دعویٰ ہے ہلا دیتی ترا دل ہر صدا — لیکن اب بے اثر ہے میں کجا اور تو کجا

نالہ ہو سکتا ہے اپنی حدِ امکاں تک سا — میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا

میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

خیر سمجھو آتشِ غم دل میں جبتک ہے نہاں — ورنہ پھر چھوڑ نگی کیا دنیا میں یہ برقِ تپاں

ذکر سے اسکے زبانِ شمع ہوتی ہے زباں — عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دیکھنے کو اب بھی ہے سردچراغاں جسمِ زار — دل کی ہستی پر ہے لیکن داغ کا دار و مدار

اب تو اک ظلمت کدہ سینہ ہے گو ہے داغ دار　　دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار

اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

ہے فراقِ ہمنشیناں پر طبیعت مشتعل　　کر دیا سوز و گدازِ دل نے مرزا مضمحل

کوئی دل بھی تو نظر آتا نہیں ہے غش و غل　　میں ہوا اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل

دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

۳

پنجۂ دیوِ جنوں دشمنِ داماں نکلا　　اس سے بچکر نہ کوئی تار گریباں نکلا

ننگِ ملبوس تنِ عاشقِ حیراں نکلا　　شوق ہر رنگ[۱] رقیبِ سر و ساماں نکلا

قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

دل میں ٹھہری نہ سناں کوئی گھڑی بھی یا رب　　کس بلا کی اسے حاصل ہے روانی یا رب

حسرتِ بوسۂ سوفار نہ نکلی یا رب　　زخم نے داد[۲] نہ دی تنگی دل کی یا رب

تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

---

[۱] اس شعر کا مطلب مرزا غالب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کے خط میں اس طرح لکھا ہے "رقیب بمعنی مخالف شوق سر و ساماں کا دشمن ہے دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا پڑا پھرتا تھا تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ مطلب یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر باطن عریاں ہی کھنچتی ہے جہاں کھنچتی ہے [۲] اس شعر کے متعلق مرزا صاحب نے شاکر کو لکھا ہے یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے — نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں، وہ زخم تیغ ہے جسکو دلکشا کہئے۔ یعنی زخمِ تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہونیکے اور تلوار کے زخم کی تحسین بسبب ایک طاق سا کھل جانیکے زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی۔ یعنی زائل نہ کیا تنگی کو پر افشاں بمعنی بیتاب اور یہ لفظ تیر کے مناسب حال ہے معنی یہ کہ تیر تنگی دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود ضیقِ مقام سے گھبرا کر پر افشاں و ہراسیمہ

کون ہے جسکو ہے جمعیتِ خاطر حاصل — کوئی آشفتہ کوئی منتشروں میں داخل
گھر ہے یا ہے کوئی شوریدہ سروں کی منزل — بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

خوب لوٹے ہیں مزے دلمیں جو تھی نعمت درد — کسکی تقدیر کو یوں ہاتھ لگے دولتِ درد
کیوں نہ ہوتی مجھے ہردم طلب کثرتِ درد — دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

مدتوں دل کو رہی لذت آزار پسند — تھا رگ جاں کو دم خنجر خونخوار پسند
اب بقا ہی نہیں ہے ہمیں زنہار پسند — ہے نوآموزِ فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

قطرۂ اشک جو آنکھوں سے بہایا غالب — رشکِ دریا اسے مژگاں نے بنایا غالب
تار مژگاں پہ پھر اشکوں کا لگایا غالب — دلمیں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

۴

کہتا ہے کون عشق میں فرہاد فرد تھا — ہاں تھا جو کچھ تو قیس بیاباں نورد تھا
وہ کیا جو اک ضعیفہ کے حملے میں سرد تھا — دھمکی میں مرگیا[1] جو نہ باب نبرد تھا

---

[1] فرہاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمنے صرف عشق کی دھمکی میں آکر ہی اسکی طرح جان نہیں دی بلکہ ہم تو مردانگی کیساتھ عشق اور مصائب عشق کا مقابلہ تمام عمر کرتے رہے۔

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

کچھ وقفۂ حیات جو مجھ کو عطا ہوا
تھا اس میں بھی فنا کا تصور بندھا ہوا
گویا وطن میں تھا درِ غربت کھلا ہوا
تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا

اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تحصیلِ درس صرف وفا کرچکا تھا میں
الفت کے امتحان سے فارغ ہوا تھا میں
بے مہری زمانہ سے نا آشنا تھا میں
تالیفِ نسخہائے وفا کر رہا تھا میں

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

سینہ کہ ایک تختۂ مشق جنوں ہوا اب
جو داغ ہے کہ زخم ہے وہ لالہ گوں ہوا اب
حالت ہر ایک عضو کی زار و زبوں ہوا اب
دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہوا اب

اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

یاروں نے دل لگانے کو سمجھا ہے دل لگی
حالانکہ آفتیں ہیں ہمیشہ نئی نئی
ممکن نہیں نجات ملے غم سے جیتے جی
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی

دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

حاصل غرض ہوئی نہ مرے قید و بند سے
تھا مدعا کہ گھر میں یہ وحشی پڑا رہے
چھوٹی نہ اپنی خو دلِ آوارہ گرد نے
احباب چارہ جوئی وحشت نہ کر سکے

زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

مرزاؔ[1] یہ رسم ظلم و ستم کیا یہاں کی ہے
مٹی خراب بلبلِ ہندوستاں کی ہے
شاکی جو اس زمانۂ ناقدرداں کی ہے
یہ لاش بے کفن اسدِؔ خستہ جاں کی ہے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

۵

وعدہ پورا کبھی اس شوخ کا کوئی نہ ہوا　　قصہ کوتاہ وفا عہدِ وفا بھی نہ ہوا

فیض کچھ ہستیٔ موہوم سے اس کی نہ ہوا　　دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سب غلط ہے کہ زبرجد وہی ہوگا اعلیٰ　　جس کا نظارہ کرے مارِ سیہ کو اندھا

کس طرح کہئے کہ پتھر میں اثر یہ ہوگا　　سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا

یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

اس سے مایوس ہوا ہوں کہ جفا سے چھوٹوں　　جیتے جی دامِ غم ہوشربا سے چھوٹوں

غیر ممکن ہے کہ میں رنج و بلا سے چھوٹوں　　میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں

وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

حاشیہ صفحہ ۵۔ آمد حسرت جاں کو جدا بخشتے عجیب آزاد مرد تھا لاش کیلئے بھی پابندِ کفن ہونا گوارا نہ کیا اور اپنی آزادی مرکر بھی برقرار رکھی۔ حضرت ذوق نے بھی اپنی موت کے متعلق اسی قسم کا شعر کہا ہے ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا　　کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

[1] غالب صاحب نے سانپ اور زمرد کے متعلق چودھری عبدالغفور کو اس طرح لکھا ہے "قبولِ دعا وقت طلوع منجملہ مضامین شعری ہے جیسے کتانوں کا پرتو ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا"

دامِ افعی۔ سانپ کی پھنکار۔ زمرد سبز رنگ کا قیمتی پتھر۔ جسکے دیکھنے سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔

آصف الدولہ والئی اودھ نے اس کا تجربہ کیا۔ سانپ کے سامنے زمرد رکھا۔ لیکن سانپ اندھا نہ ہوا۔ غالب حسب منشا اسکی تائید میں سبز خط کو زمرد اور زلف کو سانپ سے تشبیہ دے کر یہ مضمون پیدا کیا ہے۔

ہم جو اس بزم میں کمتر ہیں تو کمتر ہی سہی | کم ہیں زہاد سے رندوں کے برابر ہی سہی

آئینہ اپنا مکدر ہے مکدر ہی سہی | دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی

گر نفس جادۂ سرِ منزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہو رہے تھے ترے لانے میں جو مصروف ابھی | مجھ کو ممنون بنانے کو تھے احباب سبھی

کھل گئی ان کی غرض تو نے بھی ٹالا ہے تبھی | ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی

گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا

کس سے دل کھول کے کچھ شکوۂ کلفت کیجئے | کون ہے کس سے بیانِ غم و حسرت کیجئے

کس دعا کے لئے امید اجابت کیجئے | کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ذکر کرتا تھا مسیحا کا جو سب سے غالب | تنگ مرزا تھا غم و رنج و تعب سے غالب

منتظر مرگ کا تھا دیکھئے کب سے غالب | مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب

ناتوانی سے حریف دمِ عیسیٰ[1] نہ ہوا

(۶)

نہ کچھ مرغوب آنکھوں کو ہے نظارہ گلستاں کا | نہ سودا سر میں ہے حسن و جمال حور و غلماں کا

لہ دمِ عیسیٰ: عیسیٰ کی پھونک۔ حضرت عیسیٰؑ ایک بردست پیغمبر گزرے ہیں انکے ماننے والوں کو عیسائی کہتے ہیں مسلمان بھی انکو پیغمبر مانتے ہیں انکا یہ معجزہ تھا کہ اپنی پھونک سے مردہ زندہ کر دیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں مسیحا نے مجھے حیات دینے کیلئے لب ہلائے مگر میری ناتوانی کو جنبشِ لب بھی گراں گزری اور یہ صدمہ میں برداشت نہ کرسکا۔ (باقی ص۸ پر)

ہمارا دل ہے وارفتہ بہارِ بزمِ جاناں کا ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

کیا کرتا ہے کام ابر تجھ سے ظالم تیغِ براں کا شمار آساں نہیں جور و جفائے چشمِ فتاں کا
مگر اس پر بھی دل تسبیح خوانِ نامِ جاناں کا بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

بہت کچھ سعی و کوشش کی کہ روکوں دل کے نالوں کو لبوں تک بھی نہ آنے دوں کبھی سینے سے نالوں کو
مدد دی صورتِ نے نہر بس زنداں نے نالوں کو نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

خدانا خواستہ داغِ جگر اپنا جو جل اٹھے زبانِ شمع پیدا ہو ابھی ہر اک بُنِ مو سے
ابھی دیکھے کہاں ہیں تم نے شعلے سوزِ باطن کے دکھاؤں تم کو تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

نظر آنے لگے چاروں طرف لاکھوں حسیں تجھ سے در و دیوار تیرے عکسِ رخ سے جگمگا اٹھے
ہوئے آثار ظاہر یک بیک وحدت میں کثرت کے کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

بظاہر کتنی محکم خانۂ تن کی بنا رکھی مگر خود سعیٔ صانع وجہِ اسبابِ فنا نکلی
بنے گی صاعقہ اک دن یہی صانع کی دل گری مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

گزشتہ سے پیوستہ۔ جو جنبشِ لب زندگی بخشنے والی تھی میرے لئے موت کا باعث بن گئی۔

ہیولے برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

دمِ ہیجانِ وحشت پاؤں میں ہوتا ہے اک چکر　　مری آہوں سے بن بنکر بگولے اٹھتے ہیں دن بھر
یہ نوبت صحن کی پہنچی کہ چشمک زن ہے صحرا پر　　اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر

مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

میرے جل بجھنے کی دنیا کو ناحق جستجوئیں ہیں　　جگر کی آگ کا اظہار کم ظرفوں کی خوئیں ہیں
نہ شکوے ہیں نہ لب پر سوزِ دل کی گفتگوئیں ہیں　　خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں

چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

تصور میں جو وہ تصویرِ پُر انوار باقی ہے　　یہ اک شکلِ تسلی بخشِ جانِ زار باقی ہے
ہوئے ہم خاک اس کی گرمی بازار باقی ہے　　ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے

دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

مری قسمت بری ہے آپ ہوتے ہمنشیں ورنہ　　یہ دوری دیدہ و دانستہ ہے رہتے قریں ورنہ
پسند ایذا ہے کرتے کیوں مجھے اندوہگیں ورنہ　　بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ

سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

سبب تیری خوشی کا میں نے مر جانے کو سمجھا تھا　　ترا غم دیکھ کر مجھ کو قلق ہے اپنے مرنے کا
یہ میری تعزیت اور سب سے مل ملکر زار رونا　　نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا

قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

کھلا ہے سامنے منظر عدم آباد کا غالب　　سمجھتا ہے اسے مرزا سفر کا منتہا غالب

اسی میں منتشر ہوتے ہیں اوراقِ بقا غالب　　نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

۷

کیوں ہو رہا ہے شیفتہ بربطِ نواز کا　　گرویدہ کس لئے ہے عراق و حجاز کا
ہے ہر زباں پہ راگ اسی بے نیاز کا　　محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

خنداں جو میرے حال پہ وہ ماہ پارہ ہے　　جاگے نصیب اوج پر اپنا ستارہ ہے
پژمردگی پہ میری خوشی کا اشارہ ہے　　رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

ملتا بھی ہے جو مجھ سے تو آمادۂ ستیز　　دشمن کے ساتھ رام ہے مجھ سے رمِ گریز
مجھ سے تنفر اور رقیبوں سے خیر و میز　　تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز!
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

بیتاب ہوں گا صورتِ برق و شرر نہیں　　نالے کروں گا درد سے شام و سحر نہ میں
خاموش ہوں جتاؤں گا دردِ جگر نہ میں　　صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

سب کے ہیں اسکی بزم میں ارماں نکل رہے　　آبِ بقا کے چشمہ ہیں گویا اُبل رہے

مستوں میں پے بہ پے ہیں عجب دور چل رہے ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے

ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

اسکو ہے رات دن طلب تیرِ سینہ دوز مطلوب اس کو شام ہو سحر سوزِ سینہ سوز

اس بوالہوس کو چاہیئے اک زخم تازہ روز کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز

ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

مرزا کے دل کی پوچھتے ہو بات کیا اسدؔ صدقے میں عشق کے یہ ہمہ گھر لٹا اسدؔ

برباد مفت گنجِ جواہر گیا اسدؔ تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ

سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

(۸)

ہو نوید اہلِ سخن کو خیر کا منظر کھلا باب بزلِ وجود گویا نکتہ سنجوں پر کھلا

اس بہانے سے مگر دادو دہش کا در کھلا بزمِ شاہنشاہ میں[1] اشعار کا دفتر کھلا

رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

زینتِ بزمِ فلک کا حال جب مجھ پر کھلا تب مسرت سے ذرا اپنا دلِ مضطر کھلا

شاہِ خاور چھپ گیا روئے مہِ انور کھلا شب ہوئی[2] پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا

---

[1] ان مشاعروں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت بہادر شاہ ظفر کی زیر سرپرستی قلعۂ معلی میں ہوا کرتے تھے اور جن میں مرزا صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے [2] دوسرے شعر میں مشاعرہ کی چہل پہل اور رونق کو بتکدہ کے حسن و جمال سے تشبیہ دے کر ایک لطیف بات پیدا کر دی ہے۔

اس تکلف سے کہ گویا بت کدہ کا در کھلا

چاہیئے مدت اگر یاروں کے گنواؤں فریب — انکی ہر اک تے میں چاہوں تو دکھلاؤں فریب
اعتبار انکا ب مجھے کیونکر ہو جب پاؤں فریب — گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

بزم مے میں اس سے اس ترساؤ کی کب تھی امید — نشہ میں آئندہ ملنے کی بھی دیتا ہے نوید
اس خوشی میں ہے دل وارفتہ سرگرم نشید — گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

عمر بھر دل میں رہا شاہد پرستی کا خیال — اب حقیقت کھل گئی اسکی کہ تھا اچھا خیال
اس بہشتی رو کا آخر آج کام آیا خیال — ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

واہ کیا ہر شے کا زینت دہ ہے حسن دلنشیں — حسن کے پرتو سے ہو جاتا ہے زیور بھی حسیں
نور سے اس روئے تاباں کے ہے ہر شے خوشہ چیں — منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

گھر کی ظلمت دیکھ کے بے فائدہ کیوں ہوں ملول — جو بلا نازل ہو سر پر مجھکو ہے دل سے قبول
کیوں شب تیرہ کا شکوہ لب تک آنے دوں فضول — کیوں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

جب کیا قصد سفر تو تھا طبیعت میں خیال — اپنے بیگانوں کی الفت دیجئے دل سے نکال
کر دیا ترک وطن ترک تعلق ہے محال — کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

میں نے دل پر نقش کر لی حضرت مرزا کی پند   چاپلوسی اہلِ دنیا کی نہیں مجھکو پسند
آستانِ غیر پر کیوں جاؤں ہو کر مستمند   اسکی اُمت[1] میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کار بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

۹

اسکی آمد کے تصور میں جو میں بے تاب تھا   نیند کا آنکھوں میں آنا اک خیالِ خواب تھا
اشکباری سے رواں اک سیلِ خونِ ناب تھا   شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

کنجِ تنہائی میں میں تھا اور وہاں دربارِ عام   وہ عدو کے ساتھ ہنستے تھے مجھے رونے سے کام
میں بہاتا تھا یہاں آنسو وہاں تھا دورِ جام   واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

میں یہاں سنبل کی شورش غم سے تھا آشفتہ حال   اور وہاں آراستہ ہوتے رہے زلفوں کے جال
تھی یہاں حیرت وہاں تھی آئینہ کی دیکھ بھال   واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک سے تارِ نگہ نایاب تھا

---

[1] مقطع میں غالبؔ صاحب نے شبِ معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں انکی امت میں ہوں جن کے لئے عرش پر جاتے وقت آسمان کے دروازے کھل گئے تھے پھر میرے کام کس طرح بند رہ سکتے ہیں وہ بھی کھل جائیں گے۔
معراج اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات حضرت محمدؐ کو دیگر انبیاء سے ان کا درجہ بلند کرنے کے لئے عرش پر بلایا تھا۔ رسول اللہ صلعم ایک خاص سواری (براق) پر سوار ہو کر آسمانوں کا فاصلہ طے کر کے اللہ تعالیٰ کے پاس پہونچے تھے۔

وہ وہاں کرتے تھے ہاتھوں سے حنا کی شست و شو — بہہ رہا تھا دل یہاں سینے میں ہو ہو کر لہو
چاندنا گلشن میں تھا ظلمت یہاں تھی چار سو — جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو

یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

سو گئے وہ سنتے سنتے قصہ خواں کی گفتگو — اور یہاں برسا کیا تا صبح آنکھوں سے لہو
فرش راحت پر وہ تھے اور ہم پریشاں کو بکو — یاں سر شوریدہ بے خوابی سے تھا دیوار جو

واں وہ فرق ناز محو بالش کم خواب تھا

تھی یہاں اک بیکسی مونس وہاں محفل جمی — تھا یہاں دل صرف غم عشرت وہاں در نہ تھی
وہ وہاں تھے شمع محفل تھی یہاں اک لو لگی — یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بیخودی

جلوۂ گل واں بساط صحبت احباب تھا

عیش میں وہ محو تھے میں درد و غم میں مبتلا — وہ وہاں خنداں و فرحاں میں یہاں گرم بکا
وہ وہاں سرشار بادہ میں یہاں لب تشنہ تھا — فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا

یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

شوق جب حد سے زیادہ مجھ کو تڑپانے لگا — سینۂ سوزاں میں میرے آگ بھڑکانے لگا
چپکے چپکے میں یہاں کچھ اپنے جی کو سمجھانے لگا — ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا

دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا

---

(۱۰)

شوق میں مضطر مثالِ ماہیِ بے آب تھا   مضطرب ایسا کہ گویا برق تھا سیماب تھا
اُسکی حالت سے پریشاں جلسۂ احباب تھا   نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

رات دن نالے ہی اس سے گوش زد تھے شکلِ نَے   یاد ہی اسکے سوا گویا نہ تھی کچھ اور لَے
جوشِ گریہ کے سوا بھاتی نہیں ہو کوئی شئے   مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

اسکے دل کی خاک کو اطلس کہوں دیبا کہوں   اس زمیں کے فرش کو یا فرشِ مخمل کا کہوں
ہے بجا قاقم سے نرمی میں اگر اعلیٰ کہوں   نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

تھا اسی کے نور کا ہر چیز میں جلوہ عیاں   ہو گیا کچھ پردۂ غفلت ہی حائل درمیاں
حیف ہے یونہی گئی صحرا نوردی رائگاں   کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

یاد ہے صیاد اپنا وہ زمانہ بھی تجھے   آب و دانہ کی ہمارے فکر رہتی تھی تجھے
بیکسوں کے حال سے غفلت نہ تھی اتنی تجھے   آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا ہی دل مہر و وفا کا باب تھا

آخر اے صیاد کیا ضد ہے تجھے کچھ تو بتا — دیکھ کر مجھ کو جو تو نے دام اکٹھا کر لیا
شوق سے یوں تیرے پھندے میں کوئی آیا بھی تھا — یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

ہونے والا تھا بپا طوفان اسکے اشک سے — پوچھتے کیا ہو کہ اک اک قطرہ سے دریا بہے
خیریت ہی ہو گئی مرزا کہ آنسو تھم گئے — میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اسکے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

۱۱

ہم جو چاہیں کسی ذرے کا بیاباں ہونا — ہے عبث چارہ و تدبیر میں حیراں ہونا
ممتنع کا کبھی ممکن نہیں امکاں ہونا — بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ابرِ مژگاں نے جو ٹھہرائی ہے برسانے کی — نوبت آئے نہ کسی دن مرے بہہ جانے کی
شکل ہونے لگی ہر گوشے میں ویرانے کی — گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

بس جو دل پر ہو مرا کچھ تو اسے روکوں تو — میں اس آوارہ کا تا چند رہونگا دل جو
اپنے انجام کو سوچوں یہ مجھے ہوش بھی ہو — وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

بخت آئینہ تیرے حسن سے کیا چمکا ہے — سامنے آنکھوں کے بے پردہ رخِ زیبا ہے

خود نمائی کا جو ہے شوق تو بیجا کیا ہے — جلوہ ازبس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے

جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

حاصل آنکھوں کو ہے جو ذوقِ تجلی مت پوچھ — انبساطِ دل سرگرم تماشا مت پوچھ

حسرتیں آج نکلنے کو ہیں کیا کیا مت پوچھ — عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنا مت پوچھ

عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یوں تو ہر دل میں ہے کس دل میں نہیں جائے نشاط — ہاں جگہ دل میں ہمارے ہی نہ کی وائے نشاط

جیتے جی سر میں رہی جوششِ سودائے نشاط — لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط

تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشق نے ذوق ہر اک چیز کو بخشا ہے جدا — سینہ مشتاق سناں سر کو تبر کا سودا

جانِ بیتاب کو ہے شوق فدا ہونے کا — عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا

لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

جیتے جی میرے نہ کی مکر و دغا سے توبہ — نہ ستم سے نہ کسی جرم و خطا سے توبہ

بھول کر بھی تو نہ کی خوفِ خدا سے توبہ — کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہوتی ہے حضرت مرزا کو جو وحشت غالب — پھر تو آجاتی ہے بلہوس کی شامت غالب

جیب [1] ان کی تو ہوتی ہے بری گت غالب — حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۱۲)

مجھ سے غم آشام کا احباب غم کھائیں گے کیا — خوگر کلفت کو وہ آرام پہونچائیں گے کیا
جوشش وحشت کے ہوتے زخم سلوائیں گے کیا — دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

اس طرح نالوگے قصہ سن سنا کر کب تلک — یہ جفا کاری روا رکھوگے ہم پر کب تلک
ہوگی آخر حاجت عرض مکرر کب تلک — بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

دوست کیوں پند و نصیحت پیٹتے ہیں خواہ مخواہ — مجھ کو کچھ دیوانہ سمجھا ہے کسی نے واہ واہ
ہوں تحیر میں کہ آخر کیا ہوا مجھ سے گناہ — حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

قتل گہہ سے روز کو ناکامیاب آتا ہوں میں — وقت عرض مدعا قاتل سے شرماتا ہوں میں
دیکھئے تو راہ پر کیونکر انھیں لاتا ہوں میں — آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا

حاشیہ گذشتہ صفحہ کا:۔ مرزا غالب صاحب کو ایک دفعہ زنداں میں بھی جانا پڑا۔ رہائی کے دن جب وہ چلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو کرتہ وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا ؎

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

چارہ سازوں نے جو زنجیروں سے باندھا یوں سہی　　ہے یہی ہیجانِ وحشت کا مداوا یوں سہی
ہو نہیں سکتا جو کوئی اور چارہ یوں سہی　　گر کیا ناصح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی

یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

ہتھکڑی اور طوق گردن گیر سے بھاگینگے کیوں　　خو گرِ ایذا ہیں ہم تعزیر سے بھاگیں گے کیوں
اس مناسب چارہ و تدبیر سے بھاگیں گے کیوں　　خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

یوں تو ہے یہ شہر اک منزل گہہ عشرت اسدؔ　　ہر طرف ہے عیش کے سامان کی کثرت اسدؔ
پیش ہے با ایں ہمہ مرزا کو یہ دقت اسدؔ　　ہے[1] اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھاویں گے کیا

---

[1] مرزا غالب سے پتہ نہیں کب یہ غزل کہی ہوگی مگر مقطع کے مصرعہ ثانی کا مضمون مندرجہ تحت خط سے وابستہ نظر آتا ہے جب کہ وہ مصائب و تنگدستی کا شکار ہو کر دہلی کو خیرباد کہنے کا ارادہ کر چکے تھے فرماتے ہیں :-

"خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے تم نے مجھے تہنیت دی تو مبارک اور میں نے تمہیں تہنیت دی تو مناسب الحمد للہ الشکر للہ بھائی سچ تو یوں ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں اگر بیرنگ بھیجوں تو کہار ماندہ الٰہ نہیں سکتا ڈاک گھر تک جائے کون؟ اپنا مقصود تمہارے والد ماجد سے اور تمہاری جدہ ماجدہ اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں، خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور بچوں کو کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں مجھ سے لے لو میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بھی بشرطان لوگوں کے لو ہار و جانے کے اس خواہش کو قبول کر لیا میرا مقصد سیاحت کا ہے، پنشن اگر کھل جائیگی تو وہ اپنے صرف میں لایا کرونگا جہاں جی لگا وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اکھڑ گیا چل دیا۔" مگر مرزا غالب صاحب نے اپنے خاندانی وقار کا پورا خیال مدنظر رکھتے ہوئے دلی چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہ دلی سے باہر نہ گئے جیسا کہ ایک خط بنام حکیم غلام نجف خاں میں لکھتے ہیں: "بھائی میرا دکھ سنو، پٹیالے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی۔"

ہمیں اس کی بزم میں بھی اگر اذن بار ہوتا　　دل غم زدہ نہ غم سے کبھی رستگار ہوتا

شب و روز وقفِ حرماں پہ امیدوار ہوتا　　یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہمیں پیشتر عیاں تھا ترا وعدہ پر نہ آنا　　بس اب اور جھوٹ کہکر ہے عبث یقین دلانا

نہ کر اب یہ عذر بیجا نہ تراش کچھ بہانا　　ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ شکستِ عہدِ الفت ہے مقام حیرت افزا　　کہ نہیں یہ کام ہرگز کسی تجھ سے نازنین کا

مگر اسقدر تو کھولا مرے دل نے یہ معما　　تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا

کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

ترے ناوکِ ستم پر دل و جاں فدا ہیں اب تو　　کہ نکالدیں انھوں نے مری حسرتیں تھیں جو جو

جو ملا ہے لطف کاوش وہ زباں سے کیا بیاں ہو　　کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ فقط مرا ہی دل تھا یہ میرا ہی تھا کلیجا　　بہزار صبر و تمکیں سبھی آفتوں کو جھیلا

کسی کوہ میں کہاں ہے مرے سوزِ غم کا یارا　　رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا

جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

یہ عجیب بات کی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — یہ انوکھی دل لگی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چال یہ نئی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح

کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

ہوا خبط چارہ گر کو کہ جو تم سے مشتعل ہے — نہیں دل کا کوئی چارہ جو یہ غم سے مضمحل ہے
نہیں سہل غم سے چھٹنا یہ شریک آب و گل ہے — غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے

غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

نہیں شب ہی مجھکو بھاری کہ دن اسکے بھی سوا ہے — وہ بلائے جاں گسل ہے تو یہ دل پہ جاں گزا ہے
کبھی جاں لبوں پہ آئی کبھی دم نکل گیا ہے — کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہمیں تھا جو شوق جلوہ تو قصور فہم کا تھا — ہے مقام شکر لیکن کہ خدا نے پردہ رکھا
رہی شرم اپنی ورنہ کسے تھا نظر کا یارا — اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا

جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ کسی پہ اپنا مرنا ہوا کھیل دوستوں کا — کہ لگا دیا ہے سب نے سر قبر ایک میلا
گئے اپنی جان سے ہم انھیں ہو گیا تماشا — ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوئی معرفت میں گویا جو تری زبان غالبؔ — تو سمجھ گیا ہے مرزا جو ہے تیری شان غالبؔ
کوئی اب بھی تجھ سے کیونکر رہے بدگمان غالبؔ — یہ مسائل[1] تصوف یہ ترا بیان غالبؔ

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۱۴)

بشر کرتا ہے بیجا ادعا کیا　　یہ کر سکتا ہے ترک مدعا کیا
اسے تو دھن ہے ہوگا کیا ہوا کیا　　ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نہیں سمجھے ہو اب تک ماجرا کیا　　کہا کیا ہم نے اور تم نے سنا کیا
مآل آخر ہے استفہام کا کیا　　تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

عدو پر لطف دونا دیکھتا ہوں　　روابط بھی زیادہ دیکھتا ہوں
مدارا میں اضافہ دیکھتا ہوں　　نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

بھنور ہیں نغمہ پرداز انا البحر　　عیاں موجوں سے آواز انا البحر
حباب بحر کو ناز انا البحر　　دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ذرا اس بے زبان دل کی صدا سن　　کچھ اپنی قدر دانی کا گلہ سن

حاشیہ گزشتہ صفحہ کا:۔ ظفر بادشاہ نے مقطع سنا تو کہا کہ ہم تو اسوقت بھی نہ سمجھتے۔ غالب نے کہا حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں یہ اسلئے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔ ۱۲

یہ لعل بے بہا کہتا ہے کیا سن   سن اے غارت گر جنس وفا سن

شکست قیمت دل کی صدا کیا

ہوائے سنبل و سوسن نہیں ہے   طبیعت مائل گلشن نہیں ہے

بسائیں کیا یہاں دامن نہیں ہے   دماغ عطر پیراہن نہیں ہے

غم آوارگی ہائے صدا کیا

کیا ہے کیوں جفا کاری کا دعوےٰ   جتایا کیوں ستم گاری کا دعویٰ

تجھے کیوں ہے دل آزاری کا دعویٰ   کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ

شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

ابھی تک مئے کہاں ساقی نے دی ہے   مگر حالت کمال نشہ کی ہے

کسی کی چشم میگوں دیکھ لی ہے   نفس موج محیط بیخودی ہے

تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

عبث دشمن کو جلوے کی ہوس ہے   کہ اس کو اک نگاہ گرم بس ہے

اسے کیا سوزش پنہاں سے مس ہے   فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے

ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

کبھی تو جوہر تیغ نظر دیکھ   پھر اپنے جاں نثاروں کے جگر دیکھ

نہیں الزام تجھ پر بے خطر دیکھ   محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ

شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا

اس اپنی آرزو پر مرمٹا ہوں ۔۔۔ کہ نصب العین چشم سرمہ سا ہوں
ہمہ تن شوق نظارا ہوا ہوں ۔۔۔ نگاہ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

یہ ذکرِ جلوہ فردا کیا کیوں ۔۔۔ ابھی سے کر دیا محشر بپا کیوں
تغافل اس قدر رکھا روا کیوں ۔۔۔ یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں
یہ کافر فتنہ طاقت ربا کیا

کہے کیا کوئی اس کی بات پر بات ۔۔۔ کہ ہے افسوں و جادو سر بسر بات
نہیں ہے کوئی مرزا بے اثر بات ۔۔۔ بلائے جاں ہے غالب اسکی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

۱۵

کون کہتا ہے کوئی عاشق شیدا نہ ہوا ۔۔۔ ہاں یہ دعویٰ ہے کہ ہم سا کوئی یکتا نہ ہوا
اپنی یکتائی کا دعویٰ نہیں بے جا نہ ہوا ۔۔۔ در خور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

ہم سے رکھیں نہ یہ امید کبھی اہل کرم ۔۔۔ بند ہے در تو کریں طوف صدا دیں پیہم
زعم ہے فخر ہے یاں فقر و غنا پر ہر دم ۔۔۔ بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

حسن کا تیرے زمانے میں ہے سکہ ایسا — سامنے ماہ مبیں کوئی گھڑی جم نہ سکا
۱ شرم سے بھر جہاں تاب بھی ہے روبقفا — سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
رو برو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

کب تری آنکھ کے بیمار نے چاہا درماں — کب ہوا چارہ گروں سے کہ دوا کا خواہاں
چشم بد دور اسے ہے یہ مرض راحتِ جاں — کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

کیا فغاں ہے وہ فغاں جس سے کوئی دل نہ ہلا — کیا کہیں آہ پھر اس آہ کو جو ہو نہ رسا
ہے وہ فریاد عبث جس سے کوئی گھر نہ جلا — سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

جھیلتا ہوں جو شب و روز غم و رنج و بلا — یہی مقصود تھا شاید کہ مری خلقت کا
کوئی حرماں زدہ کیا روزِ ازل اور نہ تھا — نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

سن کے ذکرِ تپشِ قلب رہے صبر کی تاب — داستانِ شبِ غم اور نہ اڑے آنکھوں سے خواب
سوزِ دل کا ہو بیاں اور جگر ہو نہ کباب — ہر بُن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خونِ ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

جرعۂ مے میں نہ ہو جلوۂ میخانہ و مل — ذرہ ذرہ میں نہ ہو سیرِ بیاباں و سبل
غنچۂ گل میں نہ آجائے نظر گلشن و گل — قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا

مدتوں خط و کتابت رہی مرزا اس سے　　تب کہیں قتل کا اقرار کیا قاتل نے

آج کچھ قتل کے سامان بھی مقتل میں ہوئے　　تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے

دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا

۱۶

بجا ہے تم کرو جو کچھ گلہ اپنے فدائی کا　　ادا اس سے نہ کچھ بھی ہو سکا حق آشنائی کا

نہ پہونچا بزم تک تو عذر ہے بیدستو پائی کا　　پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا

بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

ابھی تک تو رہا پردہ تمہاری خوش ادائی کا　　نہ ہو جائے کہیں دنیا میں شہرہ دلربائی کا

کسی دن رنگ لائے گا یہ لپکا خودنمائی کا　　نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بیوفائی کا

بہ مہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

ترے نور و ضیا سے فیض مہر و ماہ کو پہونچا　　مگر حسرت کش اک میں ہی رہا تیری تجلی کا

ترے در پر جو سائل آگیا خالی نہیں جاتا　　زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا

چراغ خانہ درویش ہو کاسہ گدائی کا

ہمیں تو یہ تمنا تھی کہ سر ہو اور ترا خنجر　　سرِ مقتل کہا کس نے کہ اے قاتل رعایت کر

یقیناً تجھ سے ہوگی باز پرس اسکی سر محشر　　نہ مار اجان کر بے جرم غافل تیری گردن پر

رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا

بحمد اللہ جب سے شیوہ طی لسانی ہے — نہ قصہ درد کا لب پر نہ کچھ غم کی کہانی ہے
خموشی میں بسر ہوتی ہے اچھی زندگانی ہے — تمنائے زباں محو سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

مرے زخموں کی صورت سے جو ملتی ہر صنوبر گل ہے — اسی صورت کا صدقہ ہے کہ قدر و قیمتِ گل ہے
مرے ہی خوں شدہ دل کا تصدق حسرت گل ہے — وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

وفاداروں سے بھی تو نے جو بد عہدی کی ٹھہرائی — شکایت بے دہن لوگوں کے لب تک بھی تری آئی
حسینوں سے زبانِ طعن آخر تو نے کھلوائی — دہانِ ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

نہ ہوگا ختم نامہ یوں تو چاہے جسقدر لکھدے — پڑھے گا کون تو دفتر کے دفتر بھی اگر لکھدے
مناسب ہے کہ مرزا کی طرح مصرع تر لکھدے — نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے
کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

(۱۷)

چپ رہے تو اس کو راحت کا گماں ہو جائیگا — جو گلہ دل کو ہے دل ہی میں نہاں رہ جائیگا
جو بیاں سے مدعا ہے رائیگاں ہو جائیگا — گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا

بے تکلف داغ مہ مُہر دہاں ہو جائے گا

پت غم سے ہے بڑھ دل کو کرب و اضطراب ہے شبِ مہ میں طبیعت کو بلا کا پیچ و تاب
رومد ایمیں کہیں پیدا نہ کر دے ماہتاب زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب

پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

راحت میں ہے کس انداز سے وہ سیمبر سو رہا ہے مست صہبائے جوانی بے خبر
یا عجب بیم و رجا میں ہوں یہ حالت دیکھکر لے تو لوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر

ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

اکو دعویٰ ابتدا میں تھا بہت کچھ عشق کا عمر بھر الفت نباہیں گے یہ اپنا قصد تھا
کچھ جب اس سے لڑی سب حوصلہ جاتا رہا دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا

یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

ری مرضی سے ہے وابستہ زمانے کی ضیا اس سے دنیا پھر گئی تو جس سے ناخوش ہو گیا
نے چاہا جس کو مقبولِ دو عالم کر دیا سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا

مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

جو مجھکو فرطِ غم میں یوں ہی خوں رونے کا خبط اور گھلنے میں رہا یوں ہی جگر اور دل کو ربط
یٹ ن ہو جائینگے دونوں کے دونوں محو و حبط گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط

شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

یکھ کر نالاں مجھے مرغ چمن میں نوحہ گر میری حالت پر کفِ افسوس ہیں برگ شجر
و جائیں چاک چاک اس غم سے غنچوں کے جگر باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر

ہر گلِ تر اک چشم خوں فشاں ہو جائے گا

منتظر میں بھی ہوں فردائے قیامت آئے تو — اپنی اپنی داد اسی دن پائیں گے انصاف جو
اک بڑی امید پر جھیلا ہے تیرے ظلم کو — وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو

اب تلک تو یہ توقع تھی کہ درماں ہو جائیگا

یاد رکھ سننے کے قابل پندِ مرزا ہے اسدؔ — ہوش میں آ گیا ہوا دل کس کو دیتا ہے اسدؔ
مبتلا اک طفل پر ہونا کچھ اچھا ہے اسدؔ — فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ

دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

۱۸

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا — کم مرض ہے مگر ذرا نہ ہوا
مجھ پہ احسان طبیب کا نہ ہوا — درد[1] منت کشِ دوا نہ ہوا

بس نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

ہو گے رسوا تمہیں کہا مانو — بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو — جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو

اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

---

[1] اس غزل کے متعلق مرزا غالب نے مرزا حاتم علی مہر کو لکھا ہے۔

"میرا کلام میرے پاس کبھی نہیں رہا۔ ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کو دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اسکے اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔ اور خط کے ساتھ مندرجہ بالا غزل بھیجی گئی "درد منت کشِ دوا نہ ہوا۔۔ الخ"۔ ..

۱

اور تجھ سا حسیں کہاں سے لائیں   حسرت دل کی داد کس سے پائیں
کس کے ہاتھوں سے زخم دل کھائیں   ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

سخن تلخ کب ہے ان کے قریب   ان سے باتیں سنے یہ کس کے نصیب
ہے حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب   کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

جب ہمیں دھن تھی انکے لانے کی   استطاعت تھی گھر سجانے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی   ہے خبر گرم ان کے آنے کی

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھپائی تھی   کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
سر تھا سجدہ تھا جبہ سائی تھی   کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابل فخر کیا ہے بات اپنی   عین احسان ہے اسکی خوشنودی
ہم نے اس پر نثار کیا شئے کی   جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غم سے خالی نہ کوئی دم گذرا   کیا ٹھکانا ہے کم نصیبی کا
کچھ نہ کچھ سلسلہ لگا ہی رہا   زخم گر دب گیا لہو نہ تھما

کام گر رُک گیا روا نہ ہوا

دعوئے دوستی زبانی ہے دل میں تو دشمنی کی ٹھانی ہے
قہر ہے یا یہ مہربانی ہے رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے

لے کے دل دلستاں روا نہ ہوا

مثل مرزا مصر وہ رہتے ہیں جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹ بہتے ہیں
سب غمِ انتظار سہتے ہیں کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

(۱۹)

یہی ہمیشہ نشیمن رہا تمنا کا رہا ہے ورد اسی میں تمام دنیا کا
مگر ہے اب اسے درکار پہن صحرا کا گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب
مجھے امیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

نہ ہونگے گل روشِ روزگار اگر ہے یہی پسے گا زیرِ قدم سبزہ زار اگر ہے یہی
لٹے گا دہر کا نقش و نگار اگر ہے یہی حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی

دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

ہنسی کا خاک سلیقہ نہیں کسی گل کو کہیں یہ سیر و تماشا نہ رنج افزا ہو

چمن کا قصد ہے یارو تو مجھ کو ساتھ نہ لو — غم فراق میں تکلیفِ سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

مثال آئینہ حیرت زدہ سراپا ہوں — امید وار تجلی روح افزا ہوں
رہین شوق ہوں سرتا بپا تمنا ہوں — ہنوز محرمِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بنِ مو کام چشم بینا کا

اب اور کیا ہے کہ انداز اس ستم گر کے — دمِ نظارہ طلب گار جسکے ہیں ہم سے
اشارہ جان کا ہوگا تو یہ بھی دے دینگے — دل اسکو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

مرے سرشک کا انداز سخت مشکل ہے — کہ قطرہ قطرہ میں پوشیدہ بحرِ کامل ہے
حساب کا کوئی دعوی کرے تو باطل ہے — نہ کہہ کہ گریہ بہ اندازِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع خرچ دریا کا

ستم جو اسکے اٹھاتا ہوں دل ہے شاد اسد — نہیں کسی سے طلبگارِ عدل و داد اسد
نہ مجھ سے اس کو نہ مرزا سے ہے عناد اسد — فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد اسد
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

(۲۰)

اس نے جب رخت پئے قطعِ منازل باندھا — چھیڑ سے ناقہ مرے گھر کے مقابل باندھا
مہ نے کل عہد سفر مہر سے کامل باندھا — جب بتقریب سفر یار نے محمل باندھا

تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

قتل کر دینے میں عشوہ تھا بڑا دست دراز — بانی قتل کرشمہ تھا نگہ تھی غماز

دیکھ کر آئینہ جب ہو گئے قتال انداز — اہل بینش نے بحیرت کدۂ شوخی ناز

جوہر آئینہ کو طوطئ بسمل باندھا

منہ ہی جس کا نہ کبھی عرض تمنا میں کھلا — اس کو حرماں کے سوا اور یہاں کیا ملتا

کام کچھ سہل نہیں تھا طلب مقصد کا — یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا

عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا

اس بیاباں میں ہے حیراں دل محزوں غالب — حال مرزا ہے تجسس میں دگرگوں غالب

ہو گیا فکر مضامیں میں جگر خوں غالب — نہ بندھے تشنگئ ذوق کے مضموں غالب

گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

۲۱

اگر میں صورت قطرہ نہ دریا سے جدا ہوتا — تو کیوں درویش قصہ بحث ہستی و نیستی کا ہوتا

مگر ہاں نفی سے اثبات پیدا بر ملا ہوتا — نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

دل بیمار تو فکر وفا میں گھل گیا اپنا — جگر باقی رہا تھا اسکو درد عشق نے کھایا

جھکا بار الم سے فرق یوں پیروں نہیں اٹھتا — ہوا جب غم سے یوں بےحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا

نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اسی کی یاد میں آٹھوں پہر دل تلملاتا ہے　　تصور اس کا مزارات دن دلکو دکھاتا ہے
خیال اسکا بھلا کب خاطرِ غمگیں سے جاتا ہے　　ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

۲۲

کب کوئی باعث خونباریِ مژگاں سمجھا　　کب کوئی علت آہ شرر افشاں سمجھا
کوئی غم خوار نہ حال دلِ نالاں سمجھا　　وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

لوٹ دنیا سے مکدر ہے مرا سینہ ہنوز　　دل میں باقی ہے ابھی کلفت دیرینہ ہنوز
خاک بھی شکل صفائی نظر آئی نہ ہنوز　　یک[1] الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

حاشیہ گذشتہ صفحہ کا: جب تخلیق عالم نہیں ہوئی تھی تب بھی خدا موجود تھا اور اگر کائنات پیدا نہ ہوتی تب بھی خدا ضرور ہر جگہ موجود ہوتا۔ اگر میں پیدا نہ کیا جاتا تو میرا وجود بھی خدا کے وجود میں مدغم ہوتا یعنی میری ہستی ہی میری بربادی کا باعث ہوئی "میری ہستی ہی اچھی تھی۔

[1] اس شعر کی شرح خود غالب صاحب نے ماسٹر پیارے لال آشوب کے خط میں اس طرح کی ہے "پہلے یہ سمجھنا چاہئیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور انکو صیقل کون کرتا ہے فولاد کی جس چیز کو صیقل کرو گے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑیگی اسکو الف صیقل کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھئے مصرع "چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا" یعنی ابتدائی سن تمیز سے مشق جنون ہے اب تک کمال فن حاصل نہیں ہوا آئینہ تمام صاف نہیں ہوگیا بس ایک لکیر صیقل کی جو ہے گویا چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاک جیب آثار جنوں میں سے ہے"

حزن و اندوہ میں ناچاری خاطر مت پوچھ　　زیست سے باعث بیزاری خاطر مت پوچھ
حال دشواری و بیماری خاطر مت پوچھ　　شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

کب یہ منظور ہے وہ جلوہ نما ہو سر بام　　کب گوارا ہے کہ وہ رخ ہو نظر گاہ عوام
چاہتا ہوں رہے مستور وہ شوخ خود کام　　بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا

چھیڑ کر غیر نے اس کو جو غضب ناک کیا　　آگ ہو کر صفت شعلۂ آتش بھڑکا
باعث طیش تو اعیار کا سفلہ پن تھا　　عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبض خس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا

قطع منزل کے لئے میں نے کمر تو باندھی　　پر نقاہت نے اجازت پئے رفتار نہ دی
نوبت نہ آئی تھی دو ایک قدم چلنے کی　　سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

کوئی پہلو بھی تو بچنے کا نہیں تھا دم مرگ　　نشتر آخر رگ جاں نے وہی کھایا دم مرگ
پیش آیا وہی تقدیر کا لکھا دم مرگ　　تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دم مرگ
دفع پیکان قضا اس قدر آساں سمجھا

یوں تو تم بھی اسے کہتے تھے جفا کار اسدؔ　　پھر بھی مرزا نے تھا کیا تمہیں ہشیار اسدؔ
کیوں ہوئے دیدہ و دانستہ گرفتار اسدؔ　　دل دیا جان کے کیوں اسکو وفادار اسدؔ

غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

(۲۳)

پھر مجھے یار کا در یاد آیا　　اپنا پھوٹا ہوا سر یاد آیا
پھر وہی خون جگر یاد آیا　　پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

تھا ترا ہجر عذاب جاں سوز　　لفظ رخصت تھا سنانِ دلدوز
پھر نصیبوں نے دکھایا یہ روز　　دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

جب ملا آنکھ پھرا لی اپنی　　نظرِ لطف کسی دن نہ ہوئی
کی نہ اک روز تغافل میں کمی　　سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

کیوں نہ فریاد مجھے ہو مشکل　　آبلے منہ میں ہیں سینہ گھائل
میں کہاں آہ و فغاں کے قابل　　عذرِ واماندگی اے حسرت دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

جستجو گر نہ تری کی جاتی　　یہ مصیبت ہی نہ جھیلی جاتی
جان کیوں مفت میں اپنی جاتی　　زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی

کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

مانتا ہوں وہ جگہ ہے اچھی ہیں وہاں عیش کے سامان سبھی
کیا کروں گا جو طبیعت نہ لگی کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اب کہاں ضعف سے یارائے فغاں آہ کی تاب نہ نالوں کی تواں
جی لرزتا ہے جو ہلتی ہے زباں آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

دل میں رہ رہ کے جو آتا ہے خیال کیا بلا دیکھئے لاتا ہے خیال
پھر مجھے غم میں پھنساتا ہے خیال پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ مگر یاد آیا

قدر مسکن کی ابھی جانی ہے یہی اس میں بھی پریشانی ہے
یہ ہے بے مثل وہ لاثانی ہے کوئی[۱] ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

خاک ابھی میں نے کہاں چھانی ہے دل دھڑکتا ہے پریشانی ہے
فرط ہیبت سے جگر پانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

---

[۱] اسی مضمون کا ایک شعر مومن نے بھی کہا ہے ؎ جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں؟ کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی۔ اسی طرح کا ایک شعر قابل مطالعہ ہے ؎

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

قائل اس کا ہے ہر انساں شاید　　　کہ بدی کی ہے مکافات بھی بد
جرم ہونے کو تھا مرزا سرزد　　　میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(۲۴)

آپ کے ساتھ کوئی دشمن بےپیر بھی تھا　　　سست رفتار کوئی ازرہ تزویر بھی تھا
دیر کرنے میں کوئی مائل تدبیر بھی تھا　　　ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم نے جو کام کیا غیر مشیت نہ کیا　　　تھا مقدر جو مرے واسطے ہونا وہ ہوا
دوں جو تنہا تمہیں الزام تو ہے میری خطا　　　تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

شاہد حال ہے ہر چند مرا حال زبوں　　　سخت حیراں ہوں کہ کیونکر تجھے آگاہ کروں
کچھ خبر بھی ہے کہ میں عاشق دیرینہ ہوں　　　تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

مجھ سے کہتا ہے کہ تو کون ہے کیا بتلا دوں　　　عاشق زار ہوں کیا اسکے سوا بتلا دوں
نہ رہا ہوں جو تجھے یاد تو آ بتلا دوں　　　تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں

کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

حد سے گذری ہوئی تھی چارہ گروں کی بیداد بھول کر بھی تو نہ لب پر کبھی لایا فریاد
دل پریشانیوں میں بھی تو رہا خرم و شاد قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد

ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

محفل یار میں اللہ رے اس کا غرّا حق تو یہ ہے کہ بڑے بول کا سر ہے نیچا
خوش ہوں اس سے کہ اثر کچھ تو ہوا آہوں کا دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا

نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

وصل شیریں سے وہ گو ہو نہ سکا شیریں کام کر گیا کام تو ایسا کہ رہا نام مدام
کہتے ہیں سنگ تراشی کو جو آپ ادنیٰ کام پیشے میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام

ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

سینہ زانو سے جو اس لئے نہ دبایا نہ سہی خنجر تیز گلے پر نہ چلایا نہ سہی
ہاتھ شمشیر کا بڑھ کر نہ لگایا نہ سہی ہم تجھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ہم پہ فائق جو سمجھتے تھے کبھی اپنا حق ان کو یہ خفیہ نویسی کا ملا کیسا
ان کی تحریر کو کیوں مانئے سرتاپا حق پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

رکھتے تھے دیدۂ دیدار طلب شوق لقا پھر جو دیکھا تو مجھے دید کا یارا ہی نہ تھا

جلوہ دیکھا بھی مگر دل کا نہ ارماں نکلا — بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

دی جو تشبیہ اسے مہر درخشاں سے کبھی — آگ غصّے سے ہوا چہرے کی رنگت بدلی

اس کی تمثیل ہی گویا کوئی دنیا میں نہ تھی — یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی

گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

انکساری سے تو جو چاہو وہ کہلو غالب — تم پہ دیکھا نہیں مرزا لئے کسی کو غالب

کوئی دعوے سے ذرا آکے کہے تو غالب — ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۲۵

دنیا میں کبھی کیا کوئی دل بر نہ ہوا تھا — بدکیش و جفا پیشہ و کافر نہ ہوا تھا

سفاک مگر تیرے برابر نہ ہوا تھا — تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا

اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

قدرت جو لگی اور حسینوں کو بنانے — اس کا کوئی ہمتا ہو نہ چاہا یہ خدا نے

پائی نہ تھی تکمیل ابھی نور و ضیا نے — چھوڑا مہ نخشب[1] کی طرح دستِ قضا نے

---

[1] مہ نخشب : وہ مصنوعی چاند جسکو حکیم ابن عطا مشہور بہ ابن مقنع نے ادویات مرکب سے تیار کیا تھا وہ چاند چاہ نخشب سے نکلتا تھا اسکی روشنی زیادہ دور تک نہ جاتی تھی وہ اصل چاند کے برابر روشن نہ تھا آخر کار کچھ عرصہ بعد فنق ہو گیا۔ کارکنان قضا و قدر نے آفتاب بنانا شروع کیا ابھی اسکی روشنی تیرے حسن و جمال کے برابر نہ ہوئی تھی کہ اسکا حال بھی ماہ نخشب کی طرح ہوا۔ ۱۲

خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

کم درّ ثمیں سے نہیں کچھ اشک ہمارے ۔۔۔ آنسو نہ ہوئے ہوتے تو گوہر ہی بنتے
ہے مادہ تو ایک ہی ایجاد میں ان کے ۔۔۔ توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

ابروسے عیاں خنجر خونخوار کا عالم ۔۔۔ مست آنکھ مگر فتنۂ بیدار کا عالم
ہو جس سے بپا حشر وہ رفتار کا عالم ۔۔۔ جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

قسمت یہ کہاں تھی کہ کبیدہ اسے دیکھوں ۔۔۔ آنکھوں سے ملوں پاؤں خوشامد کئے لوں
برسوں سے تمنا تھی کہ روٹھے تو مناؤں ۔۔۔ میں[1] سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا

لکھنے میں فرشتوں نے سمندر کو کیا خشک ۔۔۔ اک لمحہ قلم کو کبھی ہونے نہ دیا خشک
عاصی ہوں میں ایسا کہ قدم رکھتے ہی تھا خشک ۔۔۔ دریا، معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کیا سوز نہاں پر کسی آتش کو ہو تفضیل ۔۔۔ جو اس سے فوائد تھے نہیں قابلِ تفصیل
سینہ تھا مرا درہم و دینار کی زنبیل ۔۔۔ جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل

---

[1] مرزا غالب صاحب ایک خط میں خواجہ غلام غوث بیخبر کو تحریر فرماتے ہیں "پیر و مرشد باخفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سننا مجھے باور نہ آیا یہاں تک کوئی مورد عتاب نہیں ہوسکتا۔" اسی خط کے آغاز میں یہ شعر تحریر فرمایا ہے ۔۔
میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں ۔۔۔ یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا

آتش کدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

(۲۶)

میں کب فدائے خنجر قاتل نہیں رہا ۔۔۔ کب تیغ ناز یار کا بسمل نہیں رہا
لیکن وہ ضبط اب مجھے حاصل نہیں رہا ۔۔۔ عرضِ نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل میں بھرے ہیں لاکھ غم اس کے دیئے ہوئے ۔۔۔ پوچھو نہ سرگزشت کہ لب ہیں سیئے ہوئے
آیا تھا میں بقا کا تہیہ کئے ہوئے ۔۔۔ جاتا ہوں داغ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

دشمن تھے اس کے سامنے سینہ سپر کئے ۔۔۔ پھرتے تھے ہاتھ پر وہ لئے اپنا سر کئے
اب غیر ہیں کہ جن سے پھری ہے نظر کئے ۔۔۔ مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

یکساں گدا و شاہ سے یاں ساز باز ہے ۔۔۔ محمود غزنوی کے برابر ایاز ہے
دل صاف ہے کسی سے نہیں احتراز ہے ۔۔۔ بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے

لہ مرزا غالب منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں "افسوس ہے کہ تم کو میرے حال کی خبر نہیں اگر دیکھو تو جانو۔ ع جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا۔ کوئی دم ایسا نہیں کہ مجھ کو دم واپسیں کا خیال نہ ہو۔ ساٹھ برس کا ہو چکا ہوں اب کہاں تک جیوں گا۔ غزل، رباعی فارسی اردو دس ہزار بیت کہہ چکا اب کہاں تک کہوں گا۔ زندگی بری بھلی جس طرح بنی کاٹی اب فکر یہ ہے کہ دیکھئے موت کیسی ہوتی ہے اور بعد موت کیا پیش آتا ہے پھر لکھتے ہیں ۱
سہ عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ ؛ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا۔ ۱۲

یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

جب سے کھلا ہوا ہے تصور میں باب حسن ۔۔۔ پیش نظر ہے آٹھ پہر آفتاب حسن
اٹھا ہے درمیان سے گویا حجاب حسن ۔۔۔ واکر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

تھا صبح و شام در پئے کیں چرخ کج مدار ۔۔۔ تھا غم سے وقفِ دردو خلش سینہ تھا فگار
دل تھا ہزار کاوشِ حرماں سے بے قرار ۔۔۔ گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

خونابۂ جگر سے سدا مثل باغباں ۔۔۔ ہم سینچتے رہے چمنِ الفتِ بتاں
دیکھا مآل کو تو تردد تھا رائیگاں ۔۔۔ دل سے ہوائے کشت وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

یہ تیغ آزمائے تو حاضر ہے سر اسدؔ ۔۔۔ کھینچے یہ تیر اگر تو ہے سینہ سپر اسدؔ
مرزا ہوں کھیل جاؤں گا میں جان پر اسدؔ ۔۔۔ بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

(۲۷)

جس کو ہم سمجھتے تھے یارِ مہرباں اپنا ۔۔۔ ہو گیا وہی دشمن آہ ناگہاں اپنا
ہم نے اپنے ہاتھوں سے کر لیا زیاں اپنا ۔۔۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ان کو تھی ہوسناکی مے کشی میں آتنی کب　　　پیتے تھے جو میرے ساتھ کرتے تھے فقط تر لب

ضد ہی کچھ سرِ محفل ان کو چڑھ گئی بیڈھب　　　مئے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب

آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

حال اضطرابِ دل کچھ اسے دکھا سکتے　　　نالہ کے ذریعہ سے دکھ اسے سنا سکتے

لطف اس کے جلوے کا دمبدم اٹھا سکتے　　　منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

بستر اسکے کوچے میں اک طرف جمالیں گے　　　جو کڑی پڑے گی اب شوق سے اٹھالیں گے

اب تو اس سے ملنے کی راہ کچھ نکالیں گے　　　دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

دل میں ہے کہ ملنے کی خود ہی ان سے ٹھہراؤں　　　سلسلہ کتابت کا درمیاں سے اٹھواؤں

نامہ بر سے کیا ہوگا خود ہی ان کو سمجھاؤں　　　دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلاؤں

انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

ہو گیا ہوں جب عادی آستانکے سجدوں کا　　　پھر بھی تو یہیں آخر ہوں گا میں جبیں فرسا

پے بہ پے جو رات اور دن سجدے میں یہاں کرتا　　　گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا

ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

لاکھ اس کی محفل میں غیر کی رسائی ہو　　　اب کسی برائی میں لب ذرا ہلائے تو

اس کے منہ سے کھلایا ہم کو کہنا تھا جو جو ۔ تا کرے غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

روز کے ستانے سے کر دیا ہے تنگ اسنے ۔ حد سے اب تو اے مرزا بڑھ گئے ستم اسکے
کہتے ہیں عداوت ہے اسکو ہر ہنرور سے ۔ ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

۲۸

ظلم پر وہ عذر و حجت لائیں کیا ۔ غیر تاویل غلط فرمائیں کیا
چھوڑ کر ایذا دہی شرمائیں کیا ۔ جور[1] سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

جو مقدر ہے وہ ہوگا بے گماں ۔ پھر ہوں کیوں مصروف سعی رائیگاں
ہیں امیدیں بھی جو قائم ہے جہاں ۔ رات[2] دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

---

[1] مرزا غالب ایک خط میں حاتم علی مہر کو یوں تحریر فرماتے ہیں "میں نے کتابیں جا بجا بھیجیں بسبیل پارسل ارسال کیں اگرچہ پہنچنے کی خبر پائی ہے مگر تو جیہ کہیں سے نہیں آئی ع رات دن گردش ۱ہ۔ دیکھا بھائی اس غزل کا مطلع کیا ہے سہ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ÷ کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا۔ "

[2] مرزا غالب نے ایک خط بنام مرزا رحیم بیگ مصنف "ساطع برہان" لکھا ہے جس سے مرزا صاحب کی دماغی صحت علمیت اور تحقیق کا پورا اظہار ہوتا ہے لکھتے ہیں "کہہ چکا ہوں کہ نہ مجھ کو مناظرے کا دماغ، نہ ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے فراغ، آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مددگاری تھی اصاپنا یہ شعر اردو میرے در د زبان اور اس

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

صاف یوں بھی تو نہیں کہتے کہ جاؤ　　اور نہ یہ مژدہ سناتے ہیں کہ آؤ
وجہ تو اس بے نیازی کی بتاؤ　　لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

جب چلا قاصد تو ہم تھے ساتھ ساتھ　　تا درِ جاناں نہ پہونچے ساتھ ساتھ
کب گئے تھے اس سے پہلے ساتھ ساتھ　　ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

اس کے در پر ہم جو ہیں بستر جمائے　　قتل کے درپئے ہیں سب اپنے پرائے
جس کو ہمت ہو اٹھانے کی وہ آئے　　موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

شوق ہی میں ہو گئی ہستی تباہ　　جیتے جی دیکھی نہ اس کی جلوہ گاہ
مر لیے ہم موت کی حسرت میں آہ　　عمر[1] بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

یا تو خط لکھتے تھے ہم کو پے بہ پے　　یا تغافل سے کیا قصہ ہی طے
ہے تجاہل ان کا مرزا طرفہ شے　　پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

(بقیہ ص ۴۵) ہنجار سے میں زمزمہ سنج فغاں رہتا تھا ؎
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ؛ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

[1] نواب انوار الدولہ سعد الدین (شفق) کو لکھتے ہیں "الحمد للہ دریا سارا تیر چکا ہوں ساحل نزدیک ہے۔ دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے .. عمر بھر دیکھا .... الخ" پھر مرزا غالب صاحب نے حقیر کو ایسا ہی لکھا "زندگی بری بھلی جس طرح بنی کاٹی۔ اب مر رہے ہیں کہ دیکھیں موت کیسے ہوتی ہے اور بعد موت کے کیا پیش آتا ہے ع عمر بھر دیکھا .... الخ ۱۲

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

۲۹

شرط ہے اس کا ذرا جلوہ نما ہو جانا — پھر تو آساں ہے مجھے محو لقا ہو جانا
راحتِ جزو نہیں کل سے جدا ہو جانا — عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یا تو تھا مجھ سے محبت میں کبھی عہدِ ابد — اب ہے کس تفرقہ انداز کے باعث کد و کد
ہو گیا ایک ہی چٹکی میں محبت کا رد — تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہوتی تھی اس کے لئے فکرِ نئی صبح و شام — نہ ہوئی واشدگی اور نہ ہوا کچھ آرام
بسکہ درمانِ مخالف سے ثنا تھا انجام — دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

جب تلک ہم سے تعلق تھا اور اک طرح کی راہ — چھیڑ اٹھایا کئے اور ظلم کئے خواطر خواہ
دفعتاً پھر گئے کیوں آپ بتائیں تو گناہ — اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

خون اک آتشِ سیال مرے دل میں تھا — پانی ہو کر دمِ گریہ جو مژہ پہ آیا
خاک بھی تن میں بجز عنصرِ خاکی نہ رہا — ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

جلوہ گران میں تصور سے ہے تیری تمثال — مردم چشم کا آنکھوں سے نکلنا ہے محال
جی میں جو بات چھپی دیجئے کس طرح نکال — دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا محال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اپنی ہستی کو سر بزم جو کرتی ہے فنا — شمع نے مجھ سے دم گریہ یہ گھلنا سیکھا
ہیچ کسن ہے مرا گریہ ہی مری ہستی کا — ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا

سبزہ رکھتا ہے ترے پاؤں کے بوسے کی ہوس — گل کو بازار میں لائی ترے جلوے کی ہوس
تجھ تلک کس کو نہیں اڑ کے پہنچنے کی ہوس — گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گرد رہ جولانِ صبا ہو جانا

جن کو رہتی ہے صفائی کی تمنا ہر پل — خواہش تصفیۂ قلب میں وہ ہیں بیکل
کر کے رہتا ہے ہر اک رنگ میں شوق اپنا عمل — تا کہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئنہ کا ہو جانا

قابل دید ہے ہر ذرہ یہاں کا غالب — کیوں نہ پھر کیجئے نظارۂ دنیا غالب
متفق تم سے ہے اس قول میں مرزا غالب — بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

۳۰

پھر گلوں کا باغ میں منظر کھلا سبز سبز اوراق کا دفتر کھلا
یہ بہار اور ظلم یہ مجھ پر کھلا کنج میں بیٹھا ہوں، یوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم ہیں اس دھن میں کہ وہ خود ہی بلائے کون جا کر بے طلب خفت اٹھائے
جائیں جاتے ہیں اگر اپنے پرائے ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ان کو ہے دشمن کی یاری پر گھمنڈ دوستی پر جاں نثاری پر گھمنڈ
اس کو اپنی ہوشیاری پر گھمنڈ ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

داغ کھا کر دل ہوا تھا باغ باغ تھا معطر اس گلِ تر سے دماغ
یہ اندھیرے گھر کا تھا روشن چراغ واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

باز آیا ظلم سے کب وہ جواں ناز سے اس کے ہے بسمل اک جہاں
پھینک دی مژگاں نے کب اپنی سناں ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

خود ہی جب پھرتا ہے یہ گمراہ سا　　پھر کسی کا خاک ہوگا رہنما
تیر اب یہ ساتھ ہے تو حرج کیا　　مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

کب تلک برسا کرے بارانِ اشک　　چارہ کس کس کا کرے بارانِ اشک
کیا جگر ٹھنڈا کرے بارانِ اشک　　سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

ہوگیا جام مسرت جام مرگ　　تور کا بازو بنی صمصامِ مرگ
نکلی صبح زندگانی شام مرگ　　نامہ کے ساتھ آگیا پیغام مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

اس سے بڑھ کر رند کیا ہوگا کوئی　　ہو نہیں سکتا کبھی ایسا کوئی
اس کو کیا چھیڑے گا اے مرزا کوئی　　دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

ردیف (ب)

۳۱

ہے مرے واسطے سامانِ بقا موجِ شراب　　اس سے جیتا ہوں کہ ہے روح فزا موجِ شراب[۱]

۱ے حاشیہ صفحہ ۱۹۸

ایک مدت سے نہ تھی جلوہ نما موجِ شراب　　　پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دلِ دوست شنا موجِ شراب

بزمِ رندانِ قدح خوار بنا ہے گلشن　　　بادہ نوشوں کی طرح جھومتے ہیں سرو و سمن
بیخود و مست ہیں مرغانِ گلستان ہمہ تن　　　پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

مے جسے مل گئی شاہانہ دماغ اس کا ہے　　　تختِ شاہی کی بھی اس مست کو پروا کیا ہے
کون ہو اس کا شناور یہ عجب دریا ہے　　　جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

خشک اشجار کو بھی اس نے کیا بار آور　　　دور کیا ہے کہ لگیں سروِ چراغاں میں ثمر
ہوتی ہے اس کی ہوا بھی عجب اعجاز اثر　　　ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

بقیہ ۵ ۔ مرزا غالب نے اپنے ولی ہونے کے متعلق اپنی ایک غزل کے مقطع میں بھی کہا ہے ؎

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب　　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

دیکھنے والوں　　پر کیا شوخیانہ انداز اختیار کیا ہے اور　　میں غالب صاحب کسی ولی سے کم نہ تھے۔ جس کا پتہ ان کے اشعار کے الہامی کیفیت سے چلتا ہے۔ ۱۲

۱ ایران میں قاعدہ ہے کہ جب انگور پک جاتے ہیں تو سنگ مرمر کے حوضوں میں بھر دیئے جاتے ہیں۔ آفتاب کی تیزی سے دو چار دن بعد ان کا عرق نکلنا شروع ہو جاتا ہے اسوقت نوعمر لڑکے ان حوضوں میں اتر کر انگوروں کو پاؤں سے روندتے ہیں اس کے بعد مٹی کی بند منہ صراحیاں حوضوں میں ڈال دی جاتی ہیں انہی صراحیوں کو بطِ مے کہتے ہیں۔ ۱۲

موسمِ گل ہے گلستاں میں کیا کیا جادو　　پھولے پڑتے ہیں مسرت سے گلِ خنداں رو
موج میں پھرتی ہے مستانہ گلوں کی خوشبو　　چار موج اٹھتی ہیں طوفانِ ہوا سے ہر سو
موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

مے کدے میں جو شب و روز ہیں سرگرم نیاز　　ان سے پوچھے کوئی شادابیٔ گلزار کا راز
ہے یہ باراں کی کرامت نہ ہوا کا اعجاز　　جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکین بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

اپنی حسرت میں یہ نکلی گل تر سے برتر　　رنگ پر اس کے فدا دل ہو تو صدقے ہو جگر
قوتِ نامیہ نام اس کا نہ ہوا اس کا اثر　　بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

جامِ جمشید کا ہمسر ہے مرا جامِ سفال　　سامنے ہیں مری نظروں کے جہاں کے احوال
کیوں نہ حاصل ہو مری فکرِ درخشاں کو کمال　　موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

آنکھ میں آتے ہی چڑھتی ہے یہ بالائے دماغ　　موجزن دل میں ہے ہر وقت تمنائے دماغ
ہے جو مرغوب اسے منزلِ زیبا ہے دماغ　　نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ہے عجب عالمِ نورانیٔ کیفیتِ فصل　　کیفیت کوئی نہیں ثانیٔ کیفیتِ فصل
کیجیے کیوں نہ ثنا خوانیٔ کیفیتِ فصل　　ایک عالم پہ ہے طوفانیٔ کیفیتِ فصل

موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

جس کو اس بزم میں ساقی نے دیا ساغرِ مُل اس کے سر میں نہ رہا وہم و خیالِ جزو کل
شارحِ فصل گلستاں ہے نوائے بلبل شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل

رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

شوق بادہ دلِ مرزا میں بھرا پھر بیحد بعد توبہ کے کہیں پھر نہ خطا ہو سرزد
فصلِ گل جوش پہ ہے ابر کی بھی ہے آمد ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ردیف (ت)

۳۲

خارزار اتو ہوا ہے گلشن بے خارِ دوست ہے نموئے سبزہ سے صرفِ خزاں گلزارِ دوست
چھپ گئی ہے تیرگی میں تابشِ انوارِ دوست آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست

دودِ شمعِ کشتہ ہے شاید خطِ رخسارِ دوست

آنکھ اٹھائے اس کے نظارہ کو ہے کس کا جگر کیا لڑا سکتا ہے کوئی برقِ تاباں سے نظر
لن ترانی اس کو زیبا ہے کمالِ حسن پر اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر

کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

لہ حاشیہ صفحہ ۵۲ پر)

سامنے ہو کر مرے گزرا کچھ اس انداز سے ہر قدم پر پائمالی کے مزے میں سلئے لئے
کر دیا سر تا پا اک دیدۂ حیران مجھے خانہ ویراں ساز حیرت تماشا کیجئے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

غیر کے ساتھ ان کو دیکھوں گا کہاں یارا مجھے پوچھنے آئے تو دکھلایا یہ نظارا مجھے
کچھ نظر آیا نہ مرنے کے سوا چارا مجھے عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

ہوا اگر ہر آن ہم پر اک نئی افتاد ہے اپنا لب کب آشنائے شکوۂ بیداد ہے
خوش ہے وہ زاری سے اور لذت کشِ فریاد ہے چشم مار وشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

قطعہ

یہ رفافت کی جو ٹھہرائی ہے اس نے ہجر میں چاہتا ہے دیکھے دھوکا بھید کچھ لے ہجر میں
اس بہلانے سے غم و ایذا مجھے دے ہجر میں غیر یوں کرتا ہے پرسش مجھ سے اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

اودھا یہ ہے کہ ہیں تابع مرے جن و ملک مہر و مہ حور و پری و آدمی ارض و فلک

حاشیہ صفحہ ۵۳ کا :- عالمِ نزع میں میرے احباب محبوب کو اس وقت میرے پاس لائے جب میں اسکے انتظار میں بار بار آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسی انتظار میں میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں اور میں اسے دیکھ بھی نہ سکا۔ حسرت کی انتہا ہے۔ اس مضمون کا ایک شعر حضرت غالب صاحب نے اور بھی کہا ہے ؎
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس۔ ۲

یوں بیاں کرتا ہے اس محفل کی باتیں بیدھڑک　　تا کہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

میرے ہر اک درد کا ظالم لگاتا ہے سراغ　　اور یہ کہتا ہے کہ اب حاصل ہوا اس سے فراغ
کیا بتاؤں مجھ کو دکھلاتا ہے کیا کیا سبز باغ　　جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

باتوں باتوں میں لگا دیتا ہے دل میں نیشتر　　یاد دلواتا ہے باتیں یار کی آٹھوں پہر
ہے تسلی و دلاسا سے جفا مد نظر　　چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

دشمن اس کا مرسلہ آیا ستانے کے لئے　　دوست بن کر ظلم اس انداز سے اسنے کئے
ہوں تحیر میں کہ دونوں میں سے دکھ کس نے دیئے　　مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجئے سپاس لذتِ آزارِ دوست

بات جو ہوتی ہے اچھی دلمیں کھپ جاتی ہے آپ　　کھینچ کر سامع کا دل اپنی طرف لاتی ہے آپ
طبع مرزا دمبدم یہ کہکر اترا تی ہے آپ　　یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیف شعر میں غالبؔ ز بس تکرارِ دوست

ردیف (د)

۴۳

ناز کا لطف حسینوں سے گیا میرے بعد　　دلربا عشوۂ دل کش نہ رہا میرے بعد
وہ کرشمہ نہ رہا ہوشربا میرے بعد　　حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

شیوۂ غنج و دلال آج جہاں سے اٹھا　　کام سے اپنے ہوا ناز معطل گویا
اب کہاں پر کوئی دل ان سے جو ہو عہدہ برا　　منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

اب کہاں ہے کوئی سرباز بیسر مجھ سا　　تیز جس کے لئے کی جائے گی شمشیر قضا
اب تو بیکار ہے خود جوہرِ ذاتی اس کا　　درخور عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

یا کبھی ان کی پھر انگشت لہو میں تر تھی　　یا نظر آتی تھی پوروں پہ حنا کی سرخی
میرے مرتے ہی صد افسوس یہ نوبت پہونچی　　خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

آج دنیا سے اٹھی دستِ گریباں کی نزاع　　اب کبھی ایک جگہ ان کا نہ ہوگا اجماع

رہزنِ عشق سے محفوظ ہوئی دل کی متاع ۔۔۔ ہے جنوں اہلِ جنوں کیلئے آغوشِ وداع

چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

مے کدے بند ہوئے سرد ہوا گلخنِ عشق ۔۔۔ کون ایسا ہے کہ آباد کرے گلخنِ عشق

ہے کوئی اب کہ ہوا سوارِ سرِ توسنِ عشق ۔۔۔ کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق[1]

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

بزمِ الفت ہے دھواں دھار تو حیرت کیا ہے ۔۔۔ کیا تعجب ہے جو اندھیر یہاں چھایا ہے

مجھ سا پروانۂ جاں سوز کہاں پیدا ہے ۔۔۔ شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مدتوں روئیگی سر پیٹ کے حسرت میری ۔۔۔ کوئی بھی بات نہ پوچھے گا تمناؤں کی

بےکسی ہوگی پسِ مرگ لحد پر چھائی ۔۔۔ غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی

کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

چھوٹ کر مجھ سے ہوا بیکس و تنہا غالبؔ ۔۔۔ ایسا وارفتہ کہاں اس کو ملے گا غالبؔ

ہاتھ ملتا ہے جو افسوس سے مرزا غالبؔ ۔۔۔ آئے ہے بےکسی عشق پہ رونا غالبؔ

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

---

[1] مے مردافگنِ عشق ۔ مرد کو پچھاڑ دینے والی عشق کی شراب

میرے مرنے کے بعد ساقی پکا پکار کر کہہ رہا ہے کہ اب کوئی ہے جو مے مردافگن عشق کا حریف ہو یعنی عشق کی شراب کا جام پیئے۔ لیکن جب کوئی آواز نہیں آتی تو پھر چپکے سے مایوس ہو کر کہتا ہے کہ حریف مے مردافگن عشق کون ہوسکتا ہے یعنی کوئی بھی نہیں ہوسکتا۔ اس شعر میں نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساقی کی صلا

(باقی ص۵۸ پر)

ردیف (ر)

۳۴

ہوئے ہیں سدرہِ شوقِ در در و دیوار　　　نہ اس کو روک سکیں گے مگر در و دیوار

کریں گے اور اسے تیز تر در و دیوار　　　بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار

نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

شبِ فراق میں رونے کی آگئی جو امنگ　　　تو پل کی پل میں ہوا کچھ عجیب گھر کا ڈھنگ

ادھر ہے خشت کا انبار اُدھر ہے تودہ سنگ　　　وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ

کہ ہوگئے مرے دیوار و در در و دیوار

خبر جو ہے کہ سرِ شام آئیگا وہ نگار　　　تو سایہ حد سے بڑھاتا کہ ہو قدم پہ نثار

چلا ہی جاتا ہے بڑھتا ہوا نہیں ہے قرار　　　نہیں ہے سایہ کہ سنکر نویدِ مقدمِ یار

گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

چڑھا دماغ میں کچھ نشۂ شباب ایسا　　　کہ گرم کر دیا بازار خود نمائی کا

بقیہ صفحہ ۵ کا ۱ ۔ کے الفاظ ہیں۔ اس مصرعہ کو مکرر پڑھ رہا ہے ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف مردِ افگن عشق" یعنی کوئی ہے جو مردِ افگن عشق کا حریف ہو۔ پھر جب کوئی آواز پر نہیں آتا تو اسی مصرعہ کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے۔ "کون ہوتا ہے حریف ......" یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجہ اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے اس طرح مصرعہ مذکورہ کی تکرار کرنے سے یہ معنی فوراً ذہن نشین ہو جائیں گے۔

کسی سے اب تجھے مطلق حجاب بھی نہ رہا ہوئی ہے اس قدر ارزانی مئے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

سدا جو جانب دیوار و در رہا تکتا ہوا ہے آئینہ ہر سنگ و خشت حیرت کا
کئے ہیں کام مری چشم شوق نے کیا کیا جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

رہی ہمیشہ جو گردش ہی سایہ کو گھر کے یہ شوق تھا کہ بلائیں یہ اس کے گھر کی لے
نصیبِ خفتہ مرے غم کدہ کے جاگ اٹھے وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے
ہوئے فدا در و دیوار پہ در و دیوار

یہ آرزو ہے کہ اپنوں سے پائیں آزادی یہ رونق ان کی نہیں ہم کو وجۂ شادی
چہل پہل سے پریشان ہیں دل سے فریادی نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

ہمیشہ ضبط ہی گریہ کو کر لیا میں نے اُمنڈ کے اشک جو آئے انھیں پیا میں نے
یہ عجز دیکھ کے گھر کو بچا دیا میں نے ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پہ در و دیوار

ہر ایک جزو ہے گھر کا سرور سے بیتاب ہر ایک ذرہ نظر آ رہا ہے مست و خراب
ہمارے اشک نے گویا اٹھا دیئے ہیں حجاب نہ پوچھ بے خودی عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سربسر در و دیوار

نہ کوئی دوست ہے مرزا کہیں زمانے میں　　نہ رازداں ہے نہ ہے ہمنشیں زمانے میں
بھرے ہوئے ہیں بہت اہل کیں زمانے میں　　نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر درو دیوار

۳۵

پایا نہ میرے گھر کو ستم گر کہے بغیر　　ڈھونڈا ہے گھر رقیب کا کیونکر کہے بغیر
سمجھا مرا پتہ نہ مکرر کہے بغیر　　گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
جب تک وہ دیکھتے تھے کہ ہے قدرت سخن　　اک روز بھی تو مجھ کو نہ دی رخصت سخن
چھیڑا کبھی تو بولے نہیں فرصت سخن　　کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
حرماں نصیب کون ہے ہمسا جہان میں　　نکلا نہ کوئی کام ہمارا جہان میں
کس طرح دیکھئے ہو گزارا جہان میں　　کام اس سے آپڑا ہے کہ جسکا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر
کیا کیا تمہارے ہاتھ سے ہوتے نہیں ستم　　کیا کیا ہمیں پہونچتے نہیں تم سے رنج و غم
لیکن جو ہو ذرا بھی شکایت تو لو قسم　　جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ابروکو اس کی کہتے ہیں شمشیرِ خونش نیام　　تیرِ اجل ہے اس نگہہ جاں ستاں کا نام
ہوتا ہے ہر ادا کے بیاں میں اک انتظام　　مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

بہتر سمجھتا ہے کوئی پتھر کو پوجنا　　مذہب کسی کا مہرِ منوّر کو پوجنا
ایمان عاشقوں کا ہے دلبر کو پوجنا　　چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

ہوتا نہ کس طرح سے فدائے خم و سبو　　دکھلا رہا تھا عالم مستی مقام ہو
پیش نظر خدا ہو جو ساقی ہو روبرو　　ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے شیشہ و ساغر کہے بغیر

رکھتا ہوں پاس اسلئے کاغذ قلم دوات　　تحریر سے ہو تا بسہولت ہر ایک بات
ممکن ہو کوئی دن کہے سمجھوں میں کیا کورات　　بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

مرزا نے کچھ کیا جو کبھی حالِ زار عرض　　انجام یہ ہوا کہ ہوئی ناگوار عرض
یوں ہی نہ ہو کہیں دلِ نازک پہ بار عرض　　غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

(۳۶)

اس بام پر تجلی انوار دیکھ کر حیراں ہوں اپنے آپ کو ہشیار دیکھ کر
جھپکی نہ آنکھ برقِ شرربار دیکھ کر کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

رکھتی ہے رات دن تپشِ دل تپاں مجھے تابِ سکوں ہے برق کی صورت کہاں مجھے
کرنا نہ آیا سوزِ محبت نہاں مجھے آتش پرست[۱] کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
سرگرمِ نالہائے شرربار دیکھ کر

ظلم و ستم کا وقت ہے کوئی نہ جور کا اک کھیل ہو گیا کہ جب اٹھے ستا لیا
دل اب تو نام سے ہے محبت کے کانپتا کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

نوبت نہ آئی تھی کہ گلے پر مرے چلے چلنے سے اس کے پہلے ہی مرنا پڑا مجھے
یہ اور بوسے لے مرے قاتل کے ہاتھ سے آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

مستی نے تیری کھو دیا صبر و سکونِ خلق ہے لغزشِ خرام سے زخمی درونِ خلق

---

[۱] آتش پرست۔ پارسی لوگ آگ کو مظہرِ خدا سمجھ کر پرستش کرتے ہیں۔ ان کی عبادت گاہوں میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے۔ فرماتے ہیں محبوب کی جدائی میں جو میں آہ و بکا کرتا ہوں اور میرے منہ سے آگ برسانے والے نالے نکلتے ہیں تو ان کو دیکھ کر لوگ مجھے آتش پرست کہتے ہیں۔ ۱۲

شیشہ ہوا ہے باعثِ حالِ زبونِ خلق ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

پڑتا ہے دمبدم مرے سر پر الم سے ہاتھ مصروفِ سینہ کوبی ہے ہر وقت غم سے ہاتھ
قسمت کہاں وہ ہنس کے ملا تا کرم سے ہاتھ واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
مجھ کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

مضموں ہمارے تلتے ہیں لعل یمن کیساتھ نسبت ہے حرف حرف کو دُرِّ عدن کیساتھ
لیتا ہے اس کو کوئی اگر قدرِ فن کے ساتھ بک[1] جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

چلنے سے پیشتر تجھے لازم ہے دیکھ بھال رستے کی اونچ نیچ سے چلنا نہ ہو بال

---

[1] متاعِ سخن کلام کی دولت۔ ہم اپنے متاعِ سخن کے خریدار کے ہاتھ بک جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سخن فہم اور سخن شناس ہو۔ غالب اسی سلسلے میں منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کے متعلق لکھتے ہیں، یہ خط کتنا حسرت آمیز ہے "خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایک شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا جسنے میری اندھیری راتوں کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایسی شمع روشن کی جسکی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ منشی نبی بخش کو کس درجہ سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے، حالانکہ شعر میں کہتا ہوں اور شعر کہنا بھی جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہمی کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے آدھا یوسف کو دیا اور آدھا بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن و ذوق معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں۔ آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو مگر میں اس شخص کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت دنیا پر قانع ہوں" (از یادگار غالب)

پُرسنگ راہ میں بھی ہے غافل سفر محال زنار باندھ سبحہ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

دن رات خاک دشت کی یا چھانتا تھا میں یا کچھ دنوں سے نقش قدم بن رہا تھا میں
مثلِ شکستہ پا سر وادی پڑا تھا میں ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھکر

اس درجہ بدظنی ہے خدا جانے کیوں اسے ہر دم یہ وہم ہے کہ محبت ہے اور سے
کہتا ہے ہنس کے مجھ کو ہری چگ اسی لئے کیا بدگمان ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر

ہیبت بٹھائی ہوتی طلبگار نور پر خاک سیہ پہاڑ ہوا کس قصور پر
یہ گرمیاں یہ غیظ اور اک بے شعور پر گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

دیکھا جو آستانہ تو آنکھوں میں پھر گیا مرزا کا صبح و شام وہ سجدوں کا مشغلا
دیتے جو پھر لہو کے نظر آئے جا بجا سر پھوڑنا وہ غالبؔ آشفتہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

(۳۷)

یہ سرگرمی ہے ناحق میری بربادی کے ساماں پہ فضول اتنا ترس آیا ہے اس گریانِ ترساں پر

عنایت کی یہ کیوں مجبور کے حال پریشاں پر — لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

ہوئی گو عشق کے ہاتھوں زمانے بھر میں رسوائی — ہوا بے سازو سامانی پہ بھی سامانِ زیبائی

سیہ خانہ میں جب آئے کہ بھگتیں قیدِ تنہائی — نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی[۱]

سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

جنوں مانع ہوا استاد کا احساں اٹھانے سے — فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے

رہا انکار عقلِ کل کو غیر لا بتانے سے — فنا تعلیمِ درسِ بےخودی ہوں اس زمانے سے

کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

جگر میں یہ خلش ہرگز نہ رہتی نشترِ غم سے — یہ ایذا سہتے ہو تیں جو نہ یاں اب جراح کے دم سے

کوئی دم جاں کو مہلت تو ہوتی دردِ پیہم سے — فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے

بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

جدا ہے نقشۂ عالم سے سن آباد کا نقشا — وہاں بیٹھا ہے سکہ روزِ اول سے کرشمے کا

---

[۱] حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ اسلئے ان کے دوسرے بھائی ان سے بہت جلتے ایک دن سب بھائی ان کو شکار کے بہانے جنگل میں لے گئے۔ اور ان کو ایک کنوئیں میں ڈھکیل دیا۔ گھر آ کر باپ سے کہدیا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا اٹھا لے گیا۔ حضرت یعقوبؑ بہت رنجیدہ ہوئے اور یوسف کی یاد میں روتے روتے اندھے ہوگئے۔ ادھر یوسفؑ کو ایک قافلے کے لوگوں نے کنوئیں سے نکال کر عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ عزیز مصر کی بیوی زلیخا حضرت یوسف کے حسن و جمال پر عاشق ہو گئی لیکن حضرت یوسفؑ نے اسکی کوئی بات نہیں مانی۔ آخر کار مایوس ہو کر اور ان پر الزام لگا کر انکو زنداں میں ڈالدیا۔ اس شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ قید میں بھی حضرت یوسفؑ نے خانہ آرائی نہ چھوڑی۔ حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کی سفیدی زنداں کی دیواروں پر پھیر کر اسے آراستہ کر رہی تھی یعنی حسن کسی حالت میں بھی اپنی آرائش نہیں چھوڑتا۔

نالوں کے دھوئیں کا ہے شبِ تار میں نقشا — انجم میں ہے آہِ شرر افشاں کا تماشا

ہے شعلۂ الفت سے زمانے میں اجالا — لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا

ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چین — پاتا ہے کہاں بستۂ زنجیرِ الم چین

دیتے ہیں کہاں مجھکو شب و روز کے غم چین — لیتا[۱] نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین

کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

تھمتے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے — بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے

وہ جوش ہے دریا کو بھی شرماتے ہیں نالے — پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے شعرا کہتے تھے جو ہر بہت اچھے — تھے سیکڑوں ایک ایک سے بہتر بہت اچھے

مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے — ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

---

۱ مرزا غالب نے اس شعر کی تشریح جنیوں کو یوں لکھی ہے "لیتا نہ اگر دل الخ" یہ بہت لطیف تقریر ہے لیتا کو ربط ہے چین سے، کرتا مربوط ہے آہ و فغاں سے۔ اردو میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معیوب ہیں فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح اور ملیح ریختہ تقلید ہے فارسی کے حاصل معنی مصرعین یہ اگر دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا؟

نیز، پوری غزل (اس شعر کو چھوڑ کر) مرزا غالب نے حاتم علی مہر کو ارسال فرمائی تھی علاوہ ازیں اس غزل کے سات شعر اور ایک اور غزل "اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے" نواب علائی کو اپنی یادداشت پر بھیجی تھی۔ ۱۲

(۳۹)

وقفہ جو یہاں مجھکو ابھی تھا کوئی دن اور　　　تم کو بھی مناسب تھا ٹھہرنا کوئی دن اور
تم نے نہ مرا ساتھ نبا ہا کوئی دن اور　　　لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

در پر ترے اس خاص غرض سے ہوں جبیں سا　　　منظور ہے ہستی کا مجھے اپنی مٹانا
ہے سخت اگر سنگِ در اس کی نہیں پروا　　　مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

بگڑے ہوئے آثار ہیں کیا بات بناؤں　　　کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں
اک بات ذرا سی ہے جو مانو تو بتاؤں　　　آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

دیرینہ محبت کا کیا پاس نہ تم نے　　　حیرت ہے کہ کس دل سے جدا ہوتے ہو مجھ سے

لہ یہ غزل نہیں مرثیہ ہے مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارف کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم میں راہی ملک بقا ہوئے تھے جب کہ ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ غالب صاحب کے اپنے سات بچے ہوئے لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ مگر کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ نہ جیا، لہٰذا زین العابدین خاں کو جو اُن کی سالی کا لڑکا تھا متبنیٰ بنالیا، زین العابدین خاں خوش فکر ہونے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے ان کی اچانک موت کا مرزا غالب کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور یہ دلدوز نوحہ لکھا چونکہ اسی سال مومن اور تسکین بھی گذر گئے تھے اس لئے سالک نے یہ تاریخ کہی تھی ؎

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر　　　ارم میں عارف و تسکین و مومن

نالوں کے دھوئیں کا ہے شبِ تار میں نقشا — انجم میں ہے آہِ شرر افشاں کا تماشا

ہے شعلۂ الفت سے زمانے میں اجالا — لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا

ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چین — پاتا ہے کہاں بستۂ زنجیرِ الم چین

دیتے ہیں کہاں مجھکو شب و روز کے غم چین — لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین[1]

کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

تھمتے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے — بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے

وہ جوش ہے دریا کو بھی شرماتے ہیں نالے — پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے شعرا رکھتے تھے جو ہر بہت اچھے — تھے سیکڑوں ایک ایک سے بہتر بہت اچھے

مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے — ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

---

[1] مرزا غالب نے اس شعر کی نسبت جتنوں کو یاد لکھی ہے "لیتا نہ اگر دل الخ" یہ بہت لطیف تقریر ہے لیتا کو ربط ہے چین سے، کرتا مربوط ہے آہ و فغاں سے۔ عربی میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معیوب ہیں فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح اور ملیح ریختہ تقلید ہے فارسی کے حاصل معنی مصرعین یہ اگر دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا۔

نیز، پوری غزل (اس شعر کو چھوڑ کر) مرزا غالب نے حاتم علی مہر کو ارسال فرمائی تھی علاوہ ازیں اس غزل کے سات شعر اور ایک اور غزل "اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے" نواب علائی کو بھی بطور یادداشت بھیجی تھی۔ ۱۲

٣٩

ں مجھکو ابھی تھا کوئی دن اور — تم کو بھی مناسب تھا ٹھہرنا کوئی دن اور

ساتھ نبا ہا کوئی دن اور — لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور

تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

ں خاص غرض سے ہوں جبیں سا — منظور ہے ہستی کا مجھے اپنی مٹانا

سنگِ در اس کی نہیں پروا — مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا

ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

ے آثار ہیں کیا بات بناؤں — کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں

راسی ہے جو مانو تو بتاؤں — آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں

مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

ت کا کیا پاس نہ تم نے — حیرت ہے کہ کس دل سے جدا ہوتے ہو مجھ سے

یں مرثیہ ہے مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارف کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم بخا ہوئے تھے جب کہ ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ غالب صاحب کے اپنے سات بچے ہوئے لڑکے ی بھی۔ مگر کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ نہ جیا، لہٰذا زین العابدین خاں کو جو اُن کی سالی کا لڑکا با، زین العابدین خاں خوش فکر ہونے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے ان کی کا مرزا غالب کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور یہ دلدوز نوحہ لکھا چونکہ اسی سال مومن اور تسکین بھی ں سلئے سالک نے یہ تاریخ کہی تھی ؎

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر — ارم میں عارف و تسکین و مومن

باندھی ہے کمر ملک عدم کے ہیں ارادے — جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے

کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

کس ذوق سے تھا محوِ تماشا ابھی عارف — اس بزم سے کس واسطے اٹھا ابھی عارف

کیوں ہو گیا پیوندِ زمیں کا ابھی عارف — کیوں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

واللہ تمھیں گھر کے اجالے کا سبب تھے — چھایا ہے اک اندھیر مری آنکھوں کے آگے

کس خاک کے پردے میں چھپے میری نظر سے — تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے

پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

مانا کہ وہ آیا تھا فقط جان ہی لینے — ممکن تھا کہ حیلے سے اسے ٹالتے رہتے

کچھ بات بنا دیتے تو کیوں چھوٹتے ہم سے — تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

جلدی جو یہ کی جانے میں کیا جی میں سمائی — جاتے ہوئے ہر ایک سے کیوں آنکھ پھرائی

افسوس نہ اپنوں کی بھی الفت تمھیں آئی — مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی

بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ناراض ہی تم تھے تو دلِ غمزدہ تھا خوش — تم سامنے تو رہتے تھے ناخوش رہے یا خوش

جب تم نہ رہے یہ تو کہو دل رہے کیا خوش — گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش

کرنا تھا جوانمرگ گزارا کوئی دن اور

چھوڑے گی ابھی جان کہاں رشتۂ قالب　　مرزا ابھی سمجھے نہیں تم اس کے مطالب
کیا زیست ہی ایسی کی جو ہو موت کا طالب　　ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

۴۰

اجابتوں پہ دعاؤں کی کیجئے کیا ناز　　نہ عجز اپنا ہوا کارگر نہ سوز و گداز
ازل میں بسکہ ہر اک شے کا ہو چکا ہے طراز　　حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نظر ہی جب نہیں پھر دوڑ دھوپ ہے بے سود　　ابھی ہے تجھ سے بہت دور منزلِ مقصود
ہر ایک ذرہ میں ہے نورِ ہستیٔ معبود　　نہ ہو بہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود؟
ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

ہم آج تک تو رہے شکلِ دیدۂ حیراں　　ہوا نہ سامنے نظروں کے حسنِ یار عیاں
گزاریں صبر میں کچھ اور دن کہاں یہ تواں　　وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجئے آئینۂ انتظار کو پرواز

رہا ہے یہ تہہ خنجر بھی ذوقِ دید میں مست　　گیا ہے جان سے پھر بھی ہوا خیال نہ پست
کیا ہے یار کے پرتو نے اسکو نیست سی ہست　　ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

عجب مقام میں مرزا ہے کیا کہوں غالبؔ　　مثال اسکو اگر دوں تو کس سے دوں غالبؔ
فضا میں عالم امکاں سے ہے فزوں غالبؔ　　نہ پوچھ وسعتِ میخانہ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

(۱۴)

مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز　　کیا مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز
مجھ کو ہے یار کا فرمان عزیز　　کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

مشکل اس کا ہے نکلنا دل سے　　ہے تعلق بھی بلا کا دل سے
تیر کو تو نے جو کھینچا دل سے　　دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

اُف نہ مرزا نے کبھی کی غالبؔ　　جو مصیبت پڑی جھیلی غالبؔ
ضبط لازم ہے تمھیں بھی غالبؔ　　تابؔ لاتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

لہ مرزا غالبؔ نے ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھا "کیوں ترک لباس کرتے ہو، پہننے کو تمہارے پاس ہے کیا جس کو اتار کر پھینکو گے ترک لباس سے قید ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پئے گزارا نہ ہوگا۔ سختی اور سستی، رنج و آرام کو ہموار کر دو۔ جس صورت ہو اسی صورت سے بہر صورت گزرنے دو۔ ع تاب لاتے الخ۔ نیز نواب علائی کو بھی لکھا "بھائیوں سے پوچھو نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جواہر خبردار میرا سلام اخوین کو اور ان کا سلام مجھ کو پہونچا دیتا ہے اس کو غنیمت جانتا ہوں۔ ع تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ الخ۔"

(۴۲)

میری ہستی ہے اک انوکھا راز ہیں بقا و فنا بہم دم ساز
ظاہر انجام ہے نہ کچھ آغاز نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تجھ کو ہنسنے سے کام صورت گل میں ہوں اور ہم نوائی بلبل
لاگ دونوں میں آپڑی بالکل تو اور آرائشِ خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

بس زیادہ نہ لے تعلّی کی غیر ممکن ہے دل کی آزادی
کیا عجب ہے کھلے یہ پردہ بھی لافِ تمکین فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

جب سے کنج قفس کیا آباد بھول کر بھی نہیں چمن کی یاد
دل نہیں چاہتا کہ ہوں آزاد ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

تنگ آیا ہوں ہجر دلبر سے کیوں نہ آنکھوں سے اشکِ خوں برسے
دل کہاں تک فراق میں ترسے وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

یہ کوئی ضبط ہے کہ میں چپ ہوں　　دل ہو خالی تو کیا لہو روؤں
روتے روتے ہوا ہے حال زبوں　　نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

تیغ برّاں تری نگاہِ تیز　　عشوہ تیرا جہاں سے گرم ستیز
خوش خرامی تری قیامت خیز　　اے ترا جلوہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

اٹھ گیا ہے نقابِ روئے نکو　　خوب نکلیں گی حسرتیں اب تو
منع پابوس سے نہ کر مجھ کو　　تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

غم سے کس دن میں جاں بلب نہ ہوا　　درد سے حال غیر کب نہ ہوا
لطف مجھ پر یہ بے سبب نہ ہوا　　مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

سرخوش و مستِ نظم رہتا تھا　　دل سے تھا شاہد سخن پہ فدا
روئے خاک اڑائے مرزا　　اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

ردیف (ک)

۴۳

چاہتے ہیں شوخ تو دنیا میں کیا کم تھا نمک   سنگ کے بدلے یہ لے سکتے تھے پتھر کا نمک
ان کے ہاتھوں کب دہانِ زخم نے چکھا نمک   زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

بے سبب کب ہے نمک سے احترازِ زخمِ دل   تو نہیں واقف تو مجھ سے پوچھ رازِ زخمِ دل
اس کی خاکِ پا چھڑک لے چارہ سازِ زخمِ دل   گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

چاہتا ہوں میں تو یہ پیدا کوئی ہمدرد ہو   اور مزہ مجھ کو یہ ہے دیکھوں اسے ہنستا ہو جو
حسرتیں نکلیں کہیں فصلِ بہاری آئے تو   مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

غیر ممکن تھا کسی مرہم سے ہو اس کا علاج   تھا اسی درماں کا طالب اس کے زخموں کا مزاج
تھی تگ و دو کس کی اس کو اور کس کی احتیاج   شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

سیکھ لے اس شوخ سے کوئی محبت کا نباہ   گو بظاہر ہو چکی ہے مجھ سے ترکِ رسم و راہ

پھر بھی مجھ پر کس قدر ہے مہربانی کی نگاہ — داد دیتا ہے مرے زخم جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

پوچھ لو آکر یہ کیسی لگ رہی ہے انکو لے — تا کہ ہو اس خستہ تن کا قصہ آسانی سے طے
تم گئے مجھ پر لگے ہونے تقاضے پے بہ پے — چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

ہے عدو سے چارہ جوئی باعث تحقیر درد — کیوں کسی کی سعی سے حاصل کروں تاثیر درد
اس کے ہنسنے سے مجھے ہاتھ آگئی تدبیر درد — غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیر درد
زخم مثل خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک

اپنی آنکھوں سے جو تیرے شوق کو پھر دیکھ لیں — حضرت مرزا بھی تیری بیخودی کی داد دیں
اب کہاں وہ زخم کھائے اور کہاں وہ لذتیں — یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

(۴۴)

ختم قصہ ہے شب ہجر بسر ہونے تک — صورت شمع ہوں مہمان سحر ہونے تک
کیا خبر حال ہو کیا تجھ کو خبر ہونے تک — آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اک تلاطم ہے بپا کیوں نہ ہے پھر دل تنگ — روز طوفان حوادث کا ہے آمادۂ جنگ

کس طرح دیکھئے بے چارہ کی نکلے گی امنگ
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

آتشِ ہجر سے حالت ہے جگر کی جو خراب — کشمکش سے ہے مری جان گرفتارِ عذاب
دل یہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے کیجئے خوں ناب — عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

تم سے اور وعدہ وفائی ہو کبھی ناممکن — دیکھ لیں خیر کہ لائے ہو خدا کو ضامن
اپنی اس دارِ فنا میں ہے بقا ہی کے دن — ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ہو گیا حسن کی ہیبت سے دلِ کوہ دو نیم — سخت حیرت ہے کہ زندہ رہے کس طرح کلیم
فرضِ عاشق ہے دمِ جلوہ کرے جان تسلیم — پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

ظرف رکھتا ہے تو کر بادہ پرستی غافل — ورنہ یہ بزم رہے گی نہ یہ ہستی غافل
تجھ کو محروم نہ کر دے تری سستی غافل — اک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

پوچھتے کیا ہو یہ مرزا سے کہ کیسا ہے مزاج — کل تھی فرصت اسے اندوہ و مصیبت سے نہ آج
وہ مرض ہے کہ معالج نہ دوا کا محتاج — غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ردیف دل)

۴۵

یہ بے شعور جب سے ہوئی مبتلائے گل
جنچتا نہیں ہے اس کی نظر میں سوائے گل

بھولی ہوئی ہے عہدِ قیام و بقائے گل
ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

مدت سے یادِ گل میں عنادل کو تھا شغف
اشجار برگ و بار سے خالی تھے صف بصف

اب گل سے شاخ شاخ ہوئی جامِ جم بکف
آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف

ٹوٹے پڑے ہیں حلقہ دامِ ہوائے گل

جوشِ بہار میں کوئی غنچہ اگر کھلا
کمتر کسی طرحِ دل صد چاک سے نہ تھا

سمجھا نہ کوئی خستگیٔ گل کا ماجرا
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا

اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

جب پابوس کی بھی اجازت مجھے نہ دو
کم قسمتی کا اپنی گلہ مجھ کو کیوں نہ ہو

مجرم بنوں لگاؤں جو آنکھوں سے پاؤں کو
خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو

رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل

گل کو جو دیکھتا ہوں کھٹکتا ہے دل میں خار
کہتا ہوں ہو نہ یہ کہیں تیرے گلے کا ہار

اس کے وجود پر ہے مجھے رشک بار بار — ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار

میرا رقیب ہے نفس عطر سائے گل

دل تنگ آگیا ہے غم روزگار سے — فرحت ہو خاک سیرِ گل و لالہ زار سے

خالی ہے ہاتھ سر میں گرانی خمار سے — شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے

مینائے بے شراب و دل بے ہوائے گل

بو باس اس نے حسن میں حاصل ضرور کی — لیکن وہ بات اس میں کہاں تیرے نور کی

تسکین کیا ہو اس سے دل ناصبور کی — سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی

خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

رکھتا ہے غنچہ دل میں ازل سے مرے چسک — سنبل کو کر رہی ہے پریشاں تری لٹک

نرگس بھی چاہتی ہے ترے نور کی جھلک — تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک

بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

پھیلی ہے جسکی بوئے دل آویز چار سو — حاصل ہے جس سے ہر گلِ خنداں کو رنگ و بو

مرزا کو جس کی باغِ جہاں میں ہے جستجو — غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو

جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

ردیف (ن)

(۴۶)

اب وہ دل اور وہ خیال کہاں　　وہ تصور وہ دیکھ بھال کہاں
وہ خوشی اور وہ ملال کہاں　　وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

جب تک آزادۂ جہاں ہم تھے　　دید بازی میں ہم نے دن کاٹے
دل ہے اب اور غم ہیں دنیا کے　　فرصت کاروبار شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

اب نہ دل میں خیال گیسو کا　　اور نہ آنکھیں ہیں محوِ شوقِ لب
ولولہ مٹ گیا جو دل میں تھا　　دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

کیا کروں گردشِ زمانہ نے　　حوصلے پست کر دیئے دل کے
نہ رہا وہ سخن کا ذوق مجھے　　تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

بہہ چکا خون دل میں جتنا تھا　　کوئی قطرہ جگر میں بھی نہ رہا

ہمنشیں طعن کیا یہ مجھ کو دیا　　ایسا آسان نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

تھے کبھی خاک آستانۂ عشق　　اب نہ وہ ہم نہ وہ زمانۂ عشق
جیب پُر تھی تو تھے یگانۂ عشق　　ہم سے چھوٹا قمارخانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جَورِ گردوں اٹھائے جاتا ہوں　　ٹھوکریں صبح و شام کھاتا ہوں
روز ایذا نئی اٹھاتا ہوں　　فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہئے مرزا کا حال کیا غالب　　بے طرح ضعف ہوگیا غالب
ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالب　　مضمحل[۱] ہوگئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

---

[۱] مرزا غالب اس شعر کے متعلق عبدالرزاق شاکر کو یوں لکھتے ہیں "بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے، پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی وجگرکاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارت عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ سے مضمحل ہوگئے قویٰ غالب ؛ وہ عناصر میں اعتدال کہاں۔
کچھ آپ کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے خط وکتابت رہتی اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں"
اس مکتوب میں آگے چل کر فرمایا ہے "اور میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو پہونچکر آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہیئے نظم و نثر کی قلم رو کا انتظام ایزد دانا وتوانا کی عنایت واعانت سے خوب ہوچکا ہے اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی وقائم رہے گا۔" آثار ایسے ہی نظر آتے ہیں۔

(۴۷)

بھاگا ہوں دام توڑ کے آفت رسیدہ ہوں　　بیجا نہیں جو سایہ سے اپنے رمیدہ ہوں
ہیبت زدہ ہوں چاشنیِ غم چشیدہ ہوں　　ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دستِ غم میں آ کے ہوئے صیاد دیدہ ہوں

کہتے ہیں یوں تو سب مجھے با اختیار ہو　　لیکن خدا گواہ جو کچھ اختیار ہو
مجبور جو ہو پھر اسے کیا اختیار ہو　　ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو
گر نالۂ کشیدہ گہ اشک چکیدہ ہوں

چکھے ہوئے ہے غصہ و غم کا مزہ دہن　　خوش ذائقہ حلاوتِ جاں سے ہو کیا دہن
اس درجہ تلخ تھا دمِ آخر مرا دہن　　جاں لب پہ آئی تب بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

بے حس ہوں مثلِ عضوِ معطل پڑا ہوا　　جنبش مجھے ہو ذرہ برابر مجال کیا
میں لائقِ جزا ہوں نہ مستوجب سزا　　نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطا
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہوں دشمن فرشتہ نہ جن و پری سے لاگ　　حیواں کی تاک میں نہ کسی آدمی سے لاگ
اپنے سے ہے لگاؤ نہ کچھ غیر ہی سے لاگ　　ہوں خاکسار پر نہیں مجھ کو کسی سے لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

پوچھو نہ ہمدمو مری حسرت کی داستاں
حرماں نصیب کرکے قضا لائی ہے یہاں
ناکامیاں نصیب میں وہ ہیں کہ الاماں
ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
خارِ الم سے دست بدنداں گزیدہ ہوں

سنبل نے اپنی زلف کے کھولے نہیں شکنج
سبزانِ باغ ابھی نہیں گرمِ دلال و غنج
باغِ خیال دل سے مٹائے ہوئے ہے رنج
ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

مسکن نہ آسماں نہ زمیں ہے مری جگہ
کرسی ہے اور نہ عرشِ بریں ہے مری جگہ
میں خود کہیں ہوں اور نہ کہیں ہے مری جگہ
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں

ہے اک زمانہ بر سرِ کین و مخالفت
دنیا کو ہے عروج میں میرے مزاحمت
پنہاں ہے مشتری کی نظر سے مری صفت
جو چاہیئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بہ قیمتِ اول خریدہ ہوں

مشرب پہ میرے کیوں ہے زمانے کو قال و قیل
میں بھی ہوں اپنے رنگ میں بے مثل و بے عدیل
نیکوں نے فرض کر لیا بر مجھ کو بے دلیل
اہلِ ورع کے زمرے میں ہرچند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقے میں میں برگزیدہ ہوں

مرزا ہی سے نہیں ہے زمانے کو کچھ حسد
میرے [illegible] بھی بن گئے انسان دام و دد
اس طرح کھائے لینے ہیں جس کی نہیں ہے حد
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد

ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(۴۸)

ہم سے بزنا و برا ہو تو بھلا کہتے ہیں لطف بیجا کو جوان پر ہے بجا کہتے ہیں
کچھ صواب اس نے کیا بھی تو خطا کہتے ہیں کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

دل پریشان ہے مضموں ہیں پریشاں اپنے ایسی آشفتہ بیانی کو کوئی خاک سنے
کہہ نہ بیٹھیں کہیں کچھ اور خدا خیر کرے آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

درد دل خود بھی جو رکھتے تو سمجھتے اسکو درد انگیز ہیں اندوہ فزا ہیں یہ تو
سازگی سے مکرا ... تجربہ کہیں سب سن لو اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

رات دن بیتی ہے بیماری کی حالت غش سے نالہ کش خاک ہوں رہتی ہے بری گت غش سے
لب نالہ آجاتا ہے ملتی ہے جو مہلت غش سے دل میں آجاتا ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہیں موحد بخدا شرک ہے دل سے مفقود ہم معبد ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود
رو بقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہے مقصود ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یوں تو کانٹوں پہ ہمیشہ ہمیں تڑپایا ہے — اب محبت کا تری لطف مگر پایا ہے
حالتِ زار پہ تو نے جو ترس کھایا ہے — پاشئ افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہرِ گیا کہتے ہیں

سوزِ باطن کا جو کچھ حال ستمگر نے سنا — دلنشیں ہونے کو تھا ہی کہ دیا ایک جھجکا
ہم نے بھی رنگ بیاں کو وہیں اپنے بدلا — اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

کرتے ہم رد و قدح اس سے تو ہوتا دل تنگ — گفتگو کرتے ہوئے رہتا ہے آمادۂ جنگ
ہاں میں ہاں اسکی ملاتے ہیں تو بڑھتی ہے امنگ — دیکھئے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

سن کے یہ سانحہ مرزا سبھی رو دیں شاید — جو سخن سنج ہیں اس غم کو نہ بھولیں شاید
بزمِ ماتم ہو بپا بزمِ سخن میں شاید — وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

۱؎ مہر گیا۔ ایک قسم کی گھاس جسکے متعلق روایت ہے کہ جو اسکو اپنے پاس رکھتا ہے لوگ اس پر مہربان ہو جاتے ہیں گویا یہ حب کا اثر رکھتی ہے جب سے تجھے رحم آیا ہے ہم نے یہی سمجھ لیا ہے کہ تیرے راستے کے کانٹے "مہر گیا" کا اثر رکھتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے تو ہم پر مہربان ہوا ہے ۱۲ ۲؎ آشفتہ نوا۔ پریشان باتیں کہنے والا۔ وحشت و شیفتہ دونوں غالب کے ہم عصر شاعر اور دوست تھے۔ اس شعر میں وحشت و شیفتہ کے الفاظ نے خاص خوبصورتی پیدا کی ہے۔ وحشت صاحب کا نام غلام علی خاں اور شیفتہ کا نام نواب مصطفیٰ خاں تھا۔ وہ جہانگیر آباد کے رئیس تھے شیفتہ صاحب ایک مانے ہوئے سخن فہم اور سخن سنج تھے جو دہلی میں رہتے تھے وہ غالب کی عظمت کے حد سے زیادہ

عشق کیا جب مثل قمری طوق گردن میں نہیں — وہ جنوں کیا پتھروں سے زخم اگر تن میں نہیں
اسکو مجنوں کیا کہیں جسکا مکاں بن میں نہیں — آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

پہلے دامن میں جو گلکاری تھی گلشن میں نہیں — لطفِ خونباری جو تھا مژگاں میں ساون میں نہیں
دل تو دل اب تو لہو رگہائے گردن میں نہیں — ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہوکر اڑ گیا خوں کہ دامن میں نہیں

چونکہ دیواریں ہوئی تھیں سجدہ گاہ آفتاب — اسلئے وہ در ہوا ہے سجدہ گاہِ آفتاب
تھی جو ذرہ دیدہ نگاہی اک گناہِ آفتاب — ہو گئے ہیں جمع اجزا نگاہِ آفتاب
ذرے اسکے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

در سیہ خانہ کا میرے اک دہانِ شیر ہے — موت کے منہ میں ہوں جینے سے طبیعت سیر ہے
ذرے اخگر ہیں زمیں خاکِ سیہ کا ڈھیر ہے — کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جسکے روزن میں نہیں

اس کو مارا اس کو زندہ کر دیا اعجاز سے — اسکو غمزے سے کیا بسمل تو اسکو ناز سے
گھر بنایا اس نے ہر دل میں نئے انداز سے — رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے

بقیہ صفحہ ۸۵ ؎ معتقد اور قدر شناس تھے ان دونوں کو اس مقطع میں یاد کرتے ہیں۔ ۱۲

انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

عمر بھر میں اس نے لے دیکر فقط سیکھا ہے طعن
دیکھئے انصاف سے تو سر بسر بیجا ہے طعن
ہے فقط نا تجربہ کاری کہ یہ کرتا ہے طعن
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

جیتے جی اس رشکِ گل کے خوب نظارے ہوئے
مر کے بھی پورے یوں ہی ارمانِ دل سارے ہوئے
قبر میں پیشِ نظر وہ گل سے رخسارے ہوئے
بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

کر نہ درماں چارہ گر مجھ خستہ و رنجور کا
ہر مسام اک زخم ہوگا اس تن محرور کا
دل کی حالت دیکھ چھتّا ہو گیا زنبور کا
قطرہ قطرہ اک ہیولا ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوق درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

کثرتِ مے پر جو شیخی پیر میخانہ کو تھی
ڈٹ گیا میں رند پینے پر تو قلعی کھل گئی
ایک کش میں خم کے خم خالی کئے اور بس نہ کی
لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

غم جو آنیکا ہے پھر کیوں نکر نہ اٹھے دل سے دود
کیا ادھیڑا پنجۂ پیری نے تن کا تار و پود
نیستی ہے اپنی ہستی اور عدم اپنا وجود
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

کس طرح مرزا ہو اسکی دیدۂ خلقت میں قدر
مال میں جسکا نہ حصہ ہو نہ دولت میں قدر

قدر کی حسرت عبث ہے جب نہ ہو قسمت میں قدر　　تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

۵۰

اب جو مستانہ گھٹا آئے برستی ایک دن　　آؤ مل جل کر اٹھائیں لطف ہستی ایک دن
دیکھ لوگے بیخودوں کی تیز دستی ایک دن　　ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

جب گرہ میں دام تھے پیرِ مغاں تھا مہرباں　　رات دن پینے پلانے سے تھی تب فرصت کہاں
مفلسی میں یا بھی نہ اس حسبکے سے باز آں زباں　　قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بے بہا اس دور کی ایک ایک ساعت جانیے　　اس کی رونق کو نہ کچھ بے شد و قیمت جانیے
زار نالی بھی جو ہو تو سازِ عشرت جانیے　　نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

زعمِ دانائی پر اس درجہ نہ کر ناداں نہ ہو　　مثلِ گل پژمردہ ہو گا ورنہ لبِ خنداں نہ ہو

لہ مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مرزا غالبؔ قرضدار ہو گئے قرض خواہوں نے نالش کر دی۔ جواب دہی میں طلب کئے گئے۔ مفتی صدر الدین صاحب کی عدالت تھی جس وقت پیشی پر گئے انھوں نے یہ شعر پڑھا ہے قرض کی پیتے تھے الخ آزردہ نے مدعی کو روپے اپنی گرہ سے ادا کر دیئے اور اس طرح مسٹر زا غالبؔ قرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۲

چار دن کی رفعت موہوم پر نازاں نہ ہو — غرّہ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو

اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

شبِ سرِ محفل جو ہاتھا پائی وہ کرنے لگا — کون کہتا ہے کہ غیروں نے اسے اُکسا دیا

اس بُرے برتاؤ میں مرزا نہیں اس کی خطا — دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

(۵۱)

ظاہر ہیں گو شفیق نہیں مہرباں نہیں — ان کے ہمارے ربط کوئی درمیاں نہیں

لیکن خفا کبھی ہم سے وہ جانِ جہاں نہیں — ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں

اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

تم پوچھنے جو آئے تو مجھ پر کرم کیا — کچھ بھی اگرچہ رسمِ عیادت نہ کی ادا

کیا کم ہے یہ نگاہِ ترحم سے دیکھنا — کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا

پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہوتا نہیں وہ رام تو ہے اس کا رم عزیز — بڑھتا ہو جس سے شوق وہ شے کیا ہے کم عزیز

خفگی کا بھی تو شوخ کی ہے ہم کو غم عزیز — ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز

نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

کیا جانے ذوق جور و جفا کو عدو سا ہیز — ہم جس سے یاد آتے ہیں ہے ظلم ہی وہ چیز

اس لطفِ معنوی کی کہاں غیر کو تمیز
ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز

نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

کیا بات میں نے کی ہے کہ تم کو بری لگی
حیرت سی نام بوسۂ لب سن کے ہو گئی

میں نے کیا سوال تو مجھ سے خطا ہوئی
بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی

آخر زباں تو رکھتے ہو تم گو دہاں نہیں

قطعہ

ہر چند خوئے یار میں اک التہاب ہے
ہر چند مجھ کو اس کی حضوری عذاب ہے

ہر چند غیظ و غصہ بوقتِ خطاب ہے
ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے

ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

لیکن جب اس سے رحم و کرم کی امید ہے
جو گفتگوئے تلخ ہے حلوائے عید ہے

اس ذوق و انبساط میں شکوہ بعید ہے
جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے

لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

صادق اگر ہے عشق تو پھر کیا ہے خوف و بیم
کر نذرِ یار گو ہر جاں بھی نہ ہو لئیم

پیدا وہ درد کر کہ ہو حالِ جگر سقیم
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم

دل میں چھری چبھو جو مژہ خونچکاں نہیں

بے داغ سینہ ہو تو نہ سینہ اسے کہو
خالی ہو سوز سے تو جگر کو نکال دو

مضطر اگر نہ ہو تو سلام ایسی جان کو　　　ہے ننگِ سینہ دل اگر آلستہ دہ نہ ہو

ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

وحشت میں سر کو پھوڑتا ہوں کھا کے پیچ و تاب　　　دیوار و در گریں کہیں ہو کچھ تو انقلاب

دیوانہ ہوں تو کیا مجھے آتا نہیں حساب　　　نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب

سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

تھا بندگی کا مادہ میری سرشت میں　　　بیت الصنم میں عمر کٹی یا کنشت میں

ہونا تھا اور خاک مرے بخت زشت میں　　　کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں

گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

ہو حرف گیر اگر ہے زباں خاص و عام کی　　　پروا نہیں کسی کے خیالاتِ خام کی

شہرت ملائکہ میں بھی ہے میرے نام کی　　　پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی

روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

مرزا سوالِ بوسۂ لب کو وہ ہر گھڑی　　　سن کر جو ٹالتا ہے تو سوجھی ہے دور کی

جب جاں بلب سنے گا تو خود ہو گا مقتضی　　　جان ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی

غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

(۵۲)

میں جو آوارہ ہوں اس میں مری تقصیر نہیں　　　میری تحریرِ جبیں لائقِ تغیر نہیں

قابلِ چارہ مری گردشِ تقدیر نہیں　　مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دل کا اک لولہ ہے جو لئے پھرتا ہے کشاں　　بیخود اتنا ہوں کہ ہے راہ بھی نظروں سے نہاں
کوئی منزل بھی تو پیدا نہیں جز وہم و گماں　　شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدہ تصویر نہیں

جان تو نذر میں جلاد کو دی جاتی ہے　　اس کے خوش کرنے کی تدبیر نئی کی جاتی ہے
لیکن امیدِ جفا قطع ہوئی جاتی ہے　　حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

نہیں ناکامیِ فریاد کی پروا مجھ کو　　نہ خیال آہ کی بربادیِ رہ کا مجھکو
ہو نہ پوری نہ سہی ہے تو تمنا مجھ کو　　رنج نومیدی جاوید گوارا مجھ کو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

خشک ہو زخم تو بے چین دل اپنا ہو جائے　　جب تلک اک زخم نیا اور نہ پیدا ہو جائے
سنگِ طفلاں جو نہ کھاؤں مجھے سودا ہو جائے　　سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازہ تقریر نہیں

کر لیا عفو کا جب وعدہ راسخ اس نے　　کون شرمندہ ہو پھر شرم گنہگاری سے
نفس کہتا ہے کرلے خوب گناہ ہونے کے مزے　　جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

وہ بھی مرزا سا جریدہ ہے بقول ناسخ　　صاحب اوصافِ حمیدہ ہے بقول ناسخ
ہند میں شاعرِ چیدہ ہے بقول ناسخ　　غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

۵۴

تری رہ گزر میں جو ہم دیکھتے ہیں　　فضا ایسی جنت میں کم دیکھتے ہیں
گل و لالہ ہر جا بہم دیکھتے ہیں　　جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ہوئے ہم جو مشتاق اس کے سخن کے　　یہ آثار گویا ہیں دیوانہ پن کے
دہن ہی نہیں اس بتِ سحر فن کے　　دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

۱؎ میر تقی میرؔ کی غزل اور ان کے کلام کی عظمت کا ہر شاعر نے اعتراف کیا ہے ذوقؔ نے کہا ہے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب　　ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

سوداؔ نے بھی کہا ہے ؎ سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ ؛ ہونا پڑا ہے تجھ سے استاد کی طرف

غالبؔ جیسے ملند اور گراں مایہ شاعر کا اس رائے سے اتفاق کہ میر تقی میرؔ کے ملند پایہ شاعر ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا جیسا کہ انھوں نے کہا ہے ؎

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ناسخؔ لکھنؤ کے مشہور شاعر اور اپنے زمانے کے استاد تھے انھوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص میر تقی میرؔ سے عقیدت نہیں رکھتا وہ بے بہرہ ہے غالبؔ نے مقطع میں ناسخؔ کے مصرعۂ ثانی کو باندھا ہے۔ ۱۲

ترے قدِ موزوں نے پایا وہ عالم عجب کیا قیامت کرے خیر مقدم
جو تو ہو خراماں تو محشر مسلّم ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

جو ہے حیرتِ آئینہ تجھ کو پیاری تو اس سے بھی بڑھکر ہے حیرت ہماری
فقط اک نگہ کی ہے امیدواری تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

رہے ہجر میں رات بھر گرم نالے گئے قافلے جانبِ عرش ان کے
نہ ہوتا نشاں تو نشاں بھی نہ پاتے سراغ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شبرو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

نہیں رکھتے مرزا کسی سے مطالب نہ دل جانبِ عیشِ دنیا ہے راغب
تماشائے زر ہے نہ دولت کے طالب بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۵۴

جلتا ہوں ان کی گرمیِ قہر و عتاب میں کیونکر مزے نہ پاؤں عذابِ عقاب میں
پوچھو نہ مجھ سے گرمیِ دوزخ کے باب میں ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذت عذاب میں

سلہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

آیا ہوں درد و غم کے لئے انتخاب میں — دن زندگی کے کاٹ رہا ہوں عذاب میں
ہوں عرصہ دراز سے اس پیچ و تاب میں — کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کیا کہیے ہوتی تھی شب غم کس طرح بسر — اختر شماریوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر
توڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر — تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

آنکھوں میں پیشتر ہی نہ تھا نیند کا گزر — کرتا تھا صبح ہجر میں سر پیٹ پیٹ کر
غفلت جو روتے روتے ہوئی شب کسی قدر — تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

لکھ تو دیا انھیں کہ مرا حال ہے زبوں — ہے ان سے آرزوئے تسلی ترا جنوں
آگاہ ان کی عادت و خصلت سے خوب ہوں — قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں ان سے خاص عام — اٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز تشنہ کام
پینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام — مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

---

[۱] تاب آتش۔ دوزخ التہاب شعلوں کا بھڑکنا۔ فرماتے ہیں محبوب کی بدخوئی بھی میرے لئے سامان راحت ہے۔ دوزخ کی آگ بھی شعلہ زنی اور بھڑکنے میں اس کی خو سے مشابہت رکھتی ہے اسلئے یہ بھی میرے لئے سامان راحت ہے اگر میں ایسا نہ سمجھوں تو کافر ہوں عشق کا ایمان یہی ہے ۱۲۔

آنکھیں بھی راہ میں جو بچھاتا ہوا چلے　　ممکن نہیں کہ مکر و فسوں غیر کا چلے
چالیس ہزار یار سے یہ پر دغا چلے　　جو مکر و فا ہو فریب اس پہ کیا چلے

کیوں بدگمان ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

دھڑکا مجھے تو یہ ہے کہ دشمن نہ آمرے　　جاتے ہوئے تمھیں مرے گھر سے نہ دیکھ لے
تم ہنستے ہنستے ہو گئے خاموش کس لئے　　میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے

ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

وہ آن میرے گھر جو چلے آئے مستِ مے　　شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طے
جلتے ... ے وصال کا وعدہ بھی کر گئے　　میں اور خط وصل خدا ساز بات ہے

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

... پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے　　لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے
... بات بات میں ہیں پیچ و تاب کے　　ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

آتا ہے یوں تو ان کو لڑانا نگاہ کا　　نظر بچا کے سب کی ملانا نگاہ کا
آفت ہے اُف مگر نہ اٹھانا نگاہ کا　　لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا[1]

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

---

[1] لگاؤ سے لگاوٹ یا محبت مراد ہے۔ فرماتے ہیں دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور نگاہ کا چرانا ایک طرف۔ اسی طرح مصرع ثانی میں لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور غصہ میں بگڑنا ایک طرف۔ دونوں مصرعے ہم پلہ اور لاجواب ہیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ ایسا ہی گزرتا ہے معشوق کی (باقی صد ۹۷)

وہ نالہ جو کہ عرش معلےٰ کو بھی ہلائے　　　وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے

وہ نالہ اور کان تک اس شوخ کے نہ جائے　　　وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے　　　مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے

لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے　　　وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی　　　دیکھا نہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی

وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی　　　غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

۵۵

جام سبو کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں　　　شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں

وہاں کچھ کمی نہیں کہ ہے تو اضطراب میں　　　کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں

یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

گذشتہ سے پیوست۔ لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے اور عاشق کی نظر میں آنکھ چرانا لگاوٹ سے بھی زیادہ دلفریب ہے اسی طرح معشوق بناؤ سنگار میں نہایت دلفریب ہوتا ہے مگر اسکا عطر سے بگڑنا اسکے بناؤ سے بدرجہا دلربا ہوجاتا ہے مولانا آزردہ جو ہمیشہ سادہ کلام کو پسند کرتے تھے اور غالب کی پیچیدہ گوئی پر حرف رکھتے تھے اس شعر کو سنکر نہایت خوش ہوئے مگر طنزاً بطور مزاح یہ کہا یہ تو ہماری طرز کا شعر ہے اسمیں غالب کی کون سی خوبی ہوئی۔ ۱۲

یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خوار و مستمند
پہونچا رہا ہے ہر متنفس ہمیں گزند ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک تھی پسند

گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

آخر ہے کیوں روح کا قالب سے انتزاع کیوں بڑھکے کرب سانس کا ہوتا ہے انقطاع
سننے سے اسکے کہتے ہیں کیوں ہوش الوداع جان کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع

گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے لینا نہیں مدم سے ادھر دم کہیں اسے
بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کی لاکھ فکر ہستی اشیا میں پے بہ پے قصہ ہوا نہ ان کے وجود و عدم کا طے
حیرت میں مبتلا ہوں کہ میں بھی ہوں طرفہ شے اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے

جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

ایجاد کیا کہ موجد و موجود ایک ہے سب معبدوں میں عابد و معبود ایک ہے
کیا ذکرِ سجدہ ساجد و مسجود ایک ہے اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

موج و حباب میں ہے مقرر وجودِ بحر ان کا وجود بھی ہے سراسر وجودِ بحر
کہئے انھیں عرض تو ہے جوہر وجودِ بحر ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

جیتے ہیں تا نہ حسن سے ہم کو ہو آگہی — ہے رہرووں کے واسطے سامان گمرہی
جب چھپ سکے نہ ذات سے پردے کی کیا رہی — شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز — نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
ہے محوِ ناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز — آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

اشیا کی ہے تصورِ اشیا سے سب نمود — دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب وجود
ہستی کی واہمے کی بدولت ہے ہست و بود — ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

مرزا کو ایک عمر سے ہے جستجوئے دوست — کچھ آرزو نہیں ہے بجز آرزوئے دوست
آنکھیں ہیں ہمنشیں کی طرف دل ہے سوئے دوست — غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

٥٦

کس طرح روکوں گریۂ شام و سحر کو میں — رونے میں رو نہ بیٹھوں کہیں چشمِ تر کو میں
کس کس کے رنج و غم میں کھپاؤں گا سر کو میں — حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مانا نہ دل سے تیرا پتہ دشمنوں کو دوں ۔ آگاہ تیرے نام سے اغیار کو کروں
آوارہ و خراب تری جستجو میں ہوں ۔ چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جس راہ میں قدم کا بھی رکھنا تھا ننگ و عار ۔ لے سر کے بل گیا اسے اللہ رے اضطرار
دم بھر کو بھی تو دل نے نہ لینے دیا قرار ۔ جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

آہ میرے قتل کو کس زعم پر ہوئے ۔ انجان تم نے جان لیا جانِ من مجھے
دھمکی میں تو وہ آئے نہ معلوم ہو جسے ۔ ہے کیا جو کس کے باندھو گے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

میں جانتا تھا مجھ کو فقط ان سے کام ہے ۔ الفت ہو ماسوا سے تو سودائے خام ہے
اس پر بھی ہے بہ قدر تو میرا اسلام ہے ۔ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

کرتا ہوں سو قدم بھی اگر طے تو شوق کیساتھ ۔ یعنی ہر اک قدم پہ ہوا لک خضر تو کیساتھ
آہستہ رو کے ساتھ کبھی تیز رو کیساتھ ۔ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کیساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر چند بت کدوں ہی میں سب عمر دی گزار ۔ لیکن خدا گواہ کہ ایماں ہے برقرار

ہاں شوقِ دید کا تو ہوں بیشک گناہگار　　خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار

کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

پھر گم ہوا تلاش میں اس کی میں دلفگار　　ہوش و حواس پر نہ رہا پھر کچھ اختیار

پھر سعی و جستجو کا جنوں سر پہ ہے سوار　　پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار

جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

پرسانِ حال کوئی ہنر کا نہیں رہا　　باقی جہاں میں قدرِ ہنرور نہیں ذرا

مجھ کو یہ زعم اب بھی ہیں گاہک ہزار ہا　　اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

مرزا مری دعا بھی یہی ہے بصد نیاز　　دیکھوں جمالِ یار میں اے ربِ کارساز

جس طرح پہلے کہہ گیا ہے اک سخن طراز　　غالب[1] خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز

دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

---

[1] مقطع میں نواب علی بہادر خاں والئی باندہ کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے مرزا غالب کو اپنے یہاں مدعو کیا تھا ایک خط میں انوار الدولہ شفق کو یوں تحریر فرماتے ہیں "میرے باندہ بندیل کھنڈ آنے کا میں نے سب سامان کر لیا ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا قصد یہ تھا کہ فتحپور تک ڈاک میں جاؤں گا وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی سواری میں جا کر باندے میں ہفتہ بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا بسبیل ڈاک دلی چلا آؤں گا ناگاہ حضور والا بیمار ہو گئے (ظفر بادشاہ) اور مرض نے طول کھینچا وہ ارادہ قوت فعل میں نہ آیا۔

(۵۷)

کون کہتا ہے خفا مجھ سے وہ مغرور نہیں　　کینہ و بغض جو مجھ سے ہے وہ مستور نہیں
لے سکے نام مرا کوئی یہ مقدور نہیں　　ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

بعد اک عمر کے بیدار ہوا طالعِ شوق　　خوش نصیبی ہے کہ چمکا تو ذرا طالعِ شوق
آج تو برسرِ یاری ہے مرا طالعِ شوق　　وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق[1]
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

ہے فقط نقطۂ موہوم اگر ہے عالم　　دہن اس شوخ دل آرا کا مگر ہے عالم
وہم ہی وہم ہے گو پیشِ نظر ہے عالم　　شاہدِ ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

غور سے دیکھ اگر رکھتا ہے چشمِ باطن　　تجھ پہ کھل جائے گا یہ عقدۂ مشکل اک دن
جزو ہو کل سے جدا یہ نہیں ہرگز ممکن　　قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

---

[1] غالب صاحب نے ایک خط شاہ عالم مارہروی کو لکھا :۔
مشفق، مکرمی! چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام کہیئے گا اور یہ پیغام پہنچائیے گا کہ حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار بقید ماہرہ کنایہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے۔ خواہشِ وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں، مصرعۂ ثانی ترمیم کے ساتھ لکھا۔

وائے ناکامی امید کہ ہمت نہ رہی　　بارِ غم جس سے اٹھاتے تھے وہ قدرت نہ رہی
حوصلہ دل کا ہوا پست وہ جرأت نہ رہی　　حسرت لے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشق پر عربدہ کے گوں تن رنجور نہیں

ہنس کے کہتے ہیں گئے آپ اگر جنت میں　　ہوں گے غلمان ہی غلمان وہاں یا حوریں
کچھ تعجب نہیں جو آپ وہاں حوریں لیں　　میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

یہ تو ممکن نہیں تو دل سے مجھے بھولا ہو　　ہاں جو اغماض سے لے کام تو چارہ کیا ہو
کچھ بہانہ بھی رہے یاد کا تو اچھا ہو　　ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل سے کسی رنگ میں معذور نہیں

اے خوشا بزم طرب جس میں بہم ہیں ہم لوگ　　دافعِ رنج و الم دشمن غم ہیں ہم لوگ
آج تک راہروِ نقشِ قدم ہیں ہم لوگ　　صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہے فدای مرے نکتوں کا فدائی غالب　　میری حکمت کا ثنا گر ہے ثنائی غالب
پوچھو مرزا سے مری نغمہ سرائی غالب　　ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

(۵۸)

قابل رجز فغانِ دلِ ناشاد نہیں　　آہ وزاری یہ مری لائق ایراد نہیں
ہے فقط یاد دہانی کوئی فریاد نہیں　　نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہے تقاضاء جفا شکوۂ بیداد نہیں

عاشقوں کو نہیں محبوب سے جاں بھی محبوب　　ہاں سمجھتے ہیں رضا جوئی دشمن معیوب
ننگِ عشاق تھا فرہاد کا بیجا اسلوب　　عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب

ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں

رکھتی تھی خانہ نشینی تگ و دو سے محروم　　اب کاوٹ دمِ وحشت ہی نہ دل ہے مغموم
گو بیاباں میں ہے آبادی و رونق معدوم　　کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم

دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

ہر تغیر سے زمانہ کے ہے عبرت مطلب　　دور اس کا سبق آموزیِ عالم کا سبب
یہ مؤدِّب وہ ہے جو خوب سکھاتا ہے ادب　　اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب

لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں

کس خموشی سے تو جھیلا کئے ہم جور و جفا　　آہ و نالہ کو کیا ضبط سمجھ کر شکوا
پھر بھی سمجھا نہ ستم گار نے پابندِ رضا　　وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا

جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں

آشیانے سے قدم اب تو نکال اپنا کہیں　　اب نہیں ہے وہ زمانہ کہ رہے گوشہ نشیں
شکر کر آج کوئی دام نہیں فرش زمیں　　سبد گل کے تلے بند کرے ہے گل چیں

۱۳ مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

دل کے لینے کو تو ہر دم تھا تقاضا لا لا　　بوسہ مانگا تو بہ تکرار یہ بولا لا لا

ف۔ خوب گل چھرّے اڑا کوئی مزاحم ہی نہیں۔

تھا تو معدوم دہن لانے معما کھولا　　نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں

شبنم اس عشرتِ گلزار پہ گریاں کیوں ہے　　دیدۂ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے
منقبض غنچۂ گل وقت بہاراں کیوں ہے　　دیدۂ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہ گزر باد نہیں

تم اگر بھول گئے اپنی حکایت غالب　　سن لو مرزا سے وہ پر درد روایت غالب
ہوگئی سہو کی یہ کیا تمھیں عادت غالب　　کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

۵۹

مرے عقائدِ راسخ میں کچھ فساد نہیں　　خدانخواستہ میں منکرِ معاد نہیں
غلط کہ یاد مجھے طولِ روزِ داد نہیں　　نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں

یہ بات ساقیِ مہوش نے کیا بنائی ہے　　کہ ہو نہ ابر تو پینے میں کیا برائی ہے
ہمیشہ کیا اسی صورت سے پی پلائی ہے　　کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر باد نہیں

کریں رقیب برائی بھی تو برا نہ کہیں　　بھلائی لاکھ ہو مجھ سے مگر بھلا نہ کہیں

کبھی زباں سے کوئی کلمہ خیر کا نہ کہیں　　جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں پاس سے ان کے تو خیر باد نہیں

دل و جگر غم و ایذائے رشک سہتے ہیں　　سرشکِ خونِ جگر چشمِ تر سے بہتے ہیں
عدو کے ساتھ وہ مصروفِ عیش رہتے ہیں　　کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کھلا ہی رہتا ہے اٹھوں پہر یہ فیض کا باب　　اس آستانے سے ملتا نہیں کسی کو جواب
جو صرفِ راہ خدا ہو نہیں کچھ اس کا حساب　　علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

رہے جہان میں ہم مبتلائے رنج مدام　　کھلی جو آنکھ تو دیکھا نہ جز غم و آلام
سنا نہیں کبھی ہم نے سرور و عیش کا نام　　جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

اک التماس تو مرزا کی بھی سنو غالب　　کرو وہ بات نتیجہ بھی جس کا ہو غالب
خفیف ہو گئے یہ چھیڑ ان سے چھوڑ دو غالب　　تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

(۶۰)

روز مضمون نیا باندھتے ہیں　　روز مرّہ بھی جدا باندھتے ہیں

تجھ کو ہم برقِ ادا باندھتے ہیں   تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

نالۂ دل کی حقیقت کیا ہے   کامیاب اس سے کوئی ہوتا ہے
چھیڑنا اس کو فقط منشا ہے   آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

تجھ کو وہ چال ہے حاصل اے عمر   دم میں طے کرتی ہے منزل اے عمر
تیری رفتار ہے کامل اے عمر   تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

بند کا جب کہ ہے بندہ مفہوم   مرگ کی پھر ہے توقع موہوم
کیوں رہیں شوقِ اجل میں مغموم   قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

سر میں رکھتا ہے نہ یہ نشۂ مل   نہ اسے نازشِ عشقِ بلبل
ناز ہے حسن پہ اپنے بالکل   نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

ان کی بندش کو سخن چیں مت پوچھ   کس طرح لیتے ہیں تحسیں مت پوچھ
شعرا کی غلط آئیں مت پوچھ   غلطیہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مجھ سے وحشی کا کیا کیا درماں ڈال دی پاؤں میں گویا جولاں
چارہ گر اپنے ہیں کتنے ناداں اہل تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

تھے وہ مرزا ہی سے پیماں غالبؔ ہم سے دھوکا نہیں آساں غالبؔ
ہم کو سمجھا کوئی ناداں غالبؔ سادہ پرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

۶۱

جب تیری خاک رہ کی برابر نہیں ہوں میں کیا شکوہ سنج جورِ مقدر نہیں ہوں میں
رہتے ہیں سنگ در کا بھی ہمسر نہیں ہوں میں دائم[۱] پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

---

[۱] خط بنام نواب کلب علی خاں۔ بعد تسلیم معروض ہے جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاریِ سلاطین تیمور ریجہ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی مقطع اس کا یہ ہے ؎
"غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا۔۔ الخ" اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں خدا کرے کہ حضرت کو پسند آئے ؎ بوڑھا ہوا ہوں قابل خدمت نہیں اسدؔ ؛ خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں
خط میں ایک قطعہ بھی لکھا تھا جس میں مقطع بدل دیا ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے:۔

در پر امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم
شائستۂ گدائے ہر در نہیں ہوں میں
بوڑھا ہوا ہوں قابل خدمت نہیں اسدؔ
خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں

ہو جائے مضطرب تو نہیں کچھ خطائے دل — انصاف شرط ہے کبھی راحت بھی پائے دل

دن رات جورِ چرخ کہاں تک اٹھائے دل — کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

بیکار کیوں سمجھتے ہیں اہلِ جہاں مجھے — نقصان کیا کسی کو ہے میرے وجود سے

سہو القلم نہیں ہوں کہ معنی بدل گئے — یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لئے

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

تجویزِ قتل مجرمِ الفت کے واسطے — ہے ننگ مدعیِ عدالت کے واسطے

یہ جور و ظلم اہلِ محبت کے واسطے — حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حضرت حقیر جانتے ہیں کس لئے مجھے — بے آبرو کیا مری تقدیر نے مجھے

نسبت نہیں ہے کوئی جمادات سے مجھے — کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے

لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

اجرامِ چرخ بھی تو نہ محروم ہوں دریغ — اور مجھ سے آج تک ہو وہی جوں کا توں دریغ

بندہ نواز کس لئے آخر ہے یوں دریغ — رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ

رتبے ہیں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

گردوں نے بوسے پاؤں کے کس شوق سے لئے — سر پر قدم تمہارے زمیں تک نے لے لئے

یہ روک ٹوک ہے تو فقط ہے مرے لئے — کرتے ہو مجھ کو منعِ قدمبوس کے لئے

کیا آسماں کے بھی برابر نہیں ہوں میں

مرزا کی طرح شغل تمھیں بھی کوئی نہ تھا
بے کار بیٹھے بیٹھے زمانہ گزر گیا

خوابیدہ بخت شکر ہے بیدار تو ہوا
غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

۶۲

تھیں کبھی زلفیں جو زیب سنبلستاں ہو گئیں
خار بن کر جلوہ گر دلدوز مژگاں ہو گئیں

شکلِ نرگس چشمہائے شوخ و فتاں ہو گئیں
لب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

آہ اے عہدِ جوانی وہ امنگیں اب کہاں
تو ہی جب رخصت ہوا پھر کیا ہے عمرِ جاوداں

ولولے ہی دل میں تھے کچھ اور جبتک تھے جواں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

---

[۱] یہ غزل دہلی اردو اخبار میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ اس ہفتہ میں جو مشاعرہ ہوا صاحب مرزا نورالدین بہادر جو لکھنؤ سے تشریف لائے تھے اور شاہزادہ والا تبار رونق افروز محفل مشاعرہ تھے ایک غزل مرزا ہی ممدوح یعنی میر مشاعرہ اور غزل جناب نجم الدولہ محمد اسد اللہ خاں غالب کی راقم اخبار کے پاس پہونچی۔ جو کہ اردو اخبار میں شائع کر دی گئی۔ غالب نے منشی حقیر کو بھی اس غزل کے متعلق لکھا ہے۔

"بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شہزادگانِ تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمیں لائے۔ حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا سو میں حکم بجا لایا اور غزل لکھی۔"

ہو گیا ہر چند پہلو سے جدا لختِ جگر　　　دیکھتی آنکھوں ہوا گم یک بیک نورِ نظر
دیدۂ بے نور واسطے شوق سے آٹھوں پہر　　　قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر

لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سیکڑوں قربانیٔ رشکِ رقابت مر گئے　　　ہیں زبانِ خلق پر دن رات جنکے تذکرے
غیر کا نظارگی ہو نا نہ چاہا عشق نے　　　شب رقیبوں سے ہیں ناخوش زنانِ مصر سے[1]

ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہو گئیں

ہم کو یہ سمجھے ہوئے ہیں اسقدر بے ننگ و نام　　　ننگ ہے ان کیلئے ہم ہوں اگر ان کے غلام
خیر اگر چاہا خدا نے پھر تو بن جائے گا کام　　　ان پری زادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام

قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

دلمیں تو بیشک اترتی ہیں یہ چھریاں بار بار　　　آنِ واحد کے لئے لیکن نہیں ان کو قرار
تیر بن کر آرہی ہیں جا رہی ہیں برق وار　　　وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار

جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

دیدیا ہے اذن درباں نے تو کھا کر پیچ و تاب　　　کم ہوا منت سماجت سے مری اسکا عتاب

---

[1] قاعدہ ہے کہ عاشق ہمیشہ رقیبوں سے ناخوش رہتے ہیں مگر زلیخا اس سے مستثنیٰ رہی یعنی وہ مصر کی عورتوں کو دیکھکر خوش ہوئی جو زلیخا پر طعنہ زن تھیں کہ تو نے ایک غلام سے عشق کیا ہے۔ زلیخا نے انھیں اپنے گھر مدعو کیا۔ جب وہ آئیں تو ایک ایک لیموں پھر ایک ایک چھری سب کے ہاتھ میں دے کر ہدایت کی کہ جب یوسف آئیں تو چھری سے لیموں کاٹ دیں مگر جب یوسف سامنے آئے تو ان کے جمال کو دیکھنے میں اتنی محو ہو گئیں کہ سب نے انتہائی وارفتگی میں بجائے لیموں کاٹنے کے اپنی انگلی کاٹ لی تب زلیخا نے کہا کہ تم مجھ پر طعنہ زن تھیں اب حسن کا اثر دیکھ لیا۔

ہو گیا ہے سہل گو محفل میں ہونا باریاب — واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب

یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

کام اچھا دے گیا صبر و سکوں انجام کار — ورنہ پہونچی تھی یہ نوبت پیرہن ہوتا تار تار

دل فغاں کرتا تو پھر ہاتھوں کو کیونکر تھا قرار — بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار

میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

میکدے میں تشنہ لب جو رندِ ناکام آ گیا — چشمۂ آب بقا تک وہ بے آشام آ گیا

جی گیا جو کشتۂ شمشیرِ آلام آ گیا — جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا

سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

اپنے نصب العین ہیں جملہ مذاہب بالعموم — نقش ہیں دل پر تمام انکے قوانین و علوم

ہیچ ہیں اپنی نظر میں لاکھ ہوان سبکی دھوم — ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ابتدا میں تو بہت کچھ دل کو تڑپاتا ہے رنج — غمزدہ کی جان کو آٹھوں پہر کھاتا ہے رنج

ضبط و استقلال سے آخر تنگ آتا ہے رنج — رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

دوستو! رونے کا میرے کیوں اڑاتے ہو مذاق — یہ لہو رونا بھی ہے آنکھوں کا حسنِ اتفاق

۱؎ اس مضمون کو مرزا غالب نے میر مہدی مجروح کے ایک خط میں اس طرح لکھا ہے "میری جان! صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر ہائے وہ آتش سیال کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔"

ہے شب ہجراں کی تاریکی زیادہ دلکو شاق　　اشکِ خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق

میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

بزم میں جو ہمنشیں تیرا ہے راتیں اسکی ہیں　　صبحِ نظارہ میں کر دیتا ہے راتیں اسکی ہیں

اس سے بھی وہ خوش نصیب ہے راتیں اسکی ہیں　　نیند اس کی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

کس غضب کا ہے یہ طوفاں خیز رونا الاماں　　اس کی آنکھوں نے تو باندھا ابرِ باراں کا سماں

کر دیئے اس نے بھی مرزا کی طرح دریا رواں　　یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں

دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

۶۳

وحشت ہے اور طاقتِ رفتار بھی نہیں　　دامن بقدرِ خلعتِ یک خار بھی نہیں

ہمسا جنوں زدہ کوئی نادار بھی نہیں　　دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں

یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

ہو کر غریقِ ورطۂ حرماں ابھر چکے　　یہ یاس جیتے جی ہے تو سمجھو کہ مر چکے

دن اپنے جب کہ شوقِ لقا میں گزر چکے　　دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے

دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملتے ہیں تجھ سے کرتے ہیں جو سر سے راہ طے　　البتہ تجھ کو پا نہیں سکتے ہیں سست پے

ممکن کبھی ہوئی نہیں کوئی محال شے — ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

میں اک نحیف و زار ہوں، طاقت نہ تواں — اس پر یہ دل کے ولولے یہ شوقِ جاں ستاں

حیرت یہ کہہ رہی ہے کہ اب جائیے کہاں — بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں

طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

سودائے سر ہے وجہِ پراگندگیِ ہوش — وحشت ابھارتی ہے کہ کر نالہ و خروش

ٹکراؤں ہائے کس سے کہ جائے جنوں کا جوش — شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش

صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دشمن ہی کچھ عناد کو سمجھا کریں شرف — پھرنے بھی دو جو پھرتے ہیں دن رات سر بکف

لیکن ہمیں جو بغض ہو کچھ بھی تو لو حلف — گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف

یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

فریاد میں جو میں نے ہلا دی کبھی زباں — قائم نہ پھر زمین رہے گی نہ آسماں

آساں میری آہِ جہاں سوز کو نہ جان — ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان

آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

ہے زخمِ زارِ سینہ کو پیکاں سے روکشی — زخمی جگر کو خنجرِ براں سے روکشی

کرتا ہے اس کا تیرِ نظر جاں سے روکشی — دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی

حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

لیتے ہیں کام اداؤں سے آلاتِ حرب کا　　خنجر کی اور تیر کی حاجت نہیں ذرا
کرتے ہیں خونِ خلق نہتے ہیں وہ تو کیا　　اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
مرزا جو بادشاہ تھا اقلیم شعر کا　　جس کا ہے ملک نظم میں جھنڈا گڑا ہوا
فرزانہ کوئی ہوگا یہ غالب گمان تھا　　دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہوشیار بھی نہیں

(٦٤)

رفو گر کس طرح شک ہو بھلا تیرے سگھڑ پن میں　　کہ بیٹھا ہے رفو کرنے مرے زخموں کے دامن میں
سمجھ لیتا جو ہوتی تجھکو کچھ بھی آنکھ اس فن میں　　نہیں ہے زخم کوئی بخیئے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشم سوزن میں
دمِ نظارۂ دیوار و در ہوں وقفِ حیرانی　　کہ اچھا رنگ لائی اشکِ چشم تر کی طغیانی
ان آنکھوں کی بدولت پھر گیا امید پر پانی　　ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
کبھی ابرو کے سر صدقے میں قبضۂ تیغ براں ہوں　　کبھی ترچھی نگاہوں کی جراحت خوارِ پیکاں ہوں
وفورِ سوزِ غم سے جلوہ گاہِ داغِ پنہاں ہوں　　ودیعت خانۂ بیداد کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

نہ پوچھو کیا بلا ہے تیرگی شبہائے ہجراں کی　　چمک ذرّے کی ہے اس میں ضیا مہرِ درخشاں کی
سیاہی مات ہے بختِ سیہ کی فردِ عصیاں کی　　بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

ہنسی یاروں نے کیا کی اک نصیحت مجھکو فرمائی　　نہ اب وہ جوشِ وحشت ہے نہ فرطِ ناشکیبائی
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی　　نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

زہے تقدیرِ آئینہ کہ یہ ہو سامنے اس کے　　کہاں پہنچا دیا شانِ خدا اس کے مقدر نے
یہ حیرت ہے ضیا پائی ہے کیا اسکی تجلی سے　　ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرہ روزن میں

کروں کیا ہمنشینوں سے مری حالت مخالف ہے　　مرا مذہب جدا سب سے مری ملت مخالف ہے
مجھے ڈالا ہے ناجنسوں میں کیا قسمت مخالف ہے　　نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

مقامِ شکوہ کیا ہے درد اگر لاکھوں دیئے مجھکو　　ذریعے بھی تو بخشے درد کی برداشت کے مجھ کو
سبکدوشی نہ ہو گی اس کے احسانات سے مجھکو　　ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھکو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

خیالِ گیسوئے پرپیچ میں پابندِ جولاں ہوں　　بتوں کے دام میں آیا ہوں اک سیدھا مسلماں ہوں
ادا پر انکی مرزا کی طرح کیونکر نہ قرباں ہوں　　اسدِ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

(۶۵)

طمانیتِ دلِ اربابِ زر میں خاک نہیں — خیالِ زر کے سوا اور سر میں خاک نہیں
چٹورپن ہے یہاں اور گھر میں خاک نہیں — مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

محال ہے کہ وہاں بختِ نارسا لے جائے — کوئی اٹھا کے چمن تک قفس مرا لیجائے
غرض ہے کیا اسے صیاد کی بلا لے جائے — مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

ہوئے ہیں فرشِ زمیں گل بہار بے حد ہے — کھڑا ادب سے سرِ راہ سروِ خوش قد ہے
وجود عرضِ مرکب گلوں سے شاید ہے — یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

جو فکر دل مجھے ہوتی تو یوں نہ گھل جاتا — سنبھالتا کسی صورت سے اس کو بہلاتا
مجھے ہی جب نہیں پروا وہ کیوں ترس کھاتا — بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

کیا خدا نے نہ مجھ کو کسی سے شرمندہ — ہوا کسی کی نہ منت کشی سے شرمندہ
نہیں ہے کچھ بھی تو ہوں اپنے جی سے شرمندہ — ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

مدام طالبِ حسن المآب ہیں مے کش　　کسی کی یاد میں بے ارتیاب ہیں مے کش
زمانہ کہتا ہے مست شراب ہیں مے کش　　خیال جلوہ گل سے خراب ہیں مے کش
شراب خانہ کی دیوار و در میں خاک نہیں
جو دیکھتے ہیں مضامین تازہ کی آمد　　مذاق اڑاتے ہیں مرزا تمام اہل حسد
کہا جب ہی تو یہ غالب نے ہو کے دِق بیحد　　ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

(۶۶)

ہم سے نہ کہئے بار بار کرتے ہو ہائے ہائے کیوں　　اپنے ہی دل سے پوچھئے زخم جگر دکھائے کیوں
فرط الم سے خونِ دل اشک میں بہہ نہ جائے کیوں　　دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
اس میں کسی کو دخل کیا ملک عدم نہیں زمین　　سر پہ اٹھا کے ہم اسے لے تو نہ جائینگے کہیں
اپنا نشاں مٹائیں گے صورت نقشِ پا یہیں　　دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں
چشم بشر میں ہو اگر حسرتِ مہر نیم روز　　دیکھ سکے نہ بھر کے جی طلعتِ مہر نیم روز
تاب کہاں کہ ہو اسے رویتِ مہر نیم روز　　جب وہ جمال دلفروز صورتِ مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

خوف سے تیرے روبرو آ نہیں سکتے مہر و ماہ انکو کہاں یہ تاب ہے دیکھیں جو تیری جلوہ گاہ

سکتہ ہو آئینہ کو بھی ڈال دے تو اگر نگاہ دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ

تیرا ہی عکس رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

دہر میں شادی و الم اصل میں دونوں ایک ہیں زندگی و محن بہم اصل میں دونوں ایک ہیں

قطرۂ آب و آبِ یم اصل میں دونوں ایک ہیں قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اُف رے عدو کا سادہ پن بگئی بوالہوس کی شرم با مدہ کر آیا تھا کفن رہ گئی بوالہوس کی شرم

ٹال گیا وہ تیغ زن رہ گئی بوالہوس کی شرم حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم

اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

ہمکو یہ دھن کہ جھپٹ نجائے راہِ صوابِ پاس وضع اسکو یہ ضد ادھر سے ہو کچھ تو جواب پاس وضع

مانع رسم و راہ ہے خوئے خراب پاس وضع واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع

راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہیں ہوں تلاشِ یار میں کہتے ہو جس کو گمرہی بک نہ لگاؤ ہمدموں تم نے یہ بات کیا کہی

اسکی جفا و مہر سے مجھ کو ہے خوب آگہی ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی

جسکو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

کم ہوئی مے کشی نہ کچھ دورِ مدام بند ہیں بزم سے اٹھ گئے سبو یا کہیں جام بند ہیں

عیش و خوشی سے میرزا خاص نہ عام بند ہیں غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

۶۷

تونے اشارے سے مجھے کیا یہ بتا دیا کہ یوں
صاف جواب دے مجھے میرے سوال کا کہ یوں

چپ سے چلے گا کام کیا لب تو ذرا ہلا کہ یوں
غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں

بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غمزہ جو اسکا دیکھ لے سینے میں پھر نہ دل رہے
ناز و کرشمہ دیکھ کر ہوش اڑیں رہے سہے

تیغ نگہ اگر چلے ہو کے لہو جگر بہے
پرسشِ طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے

اسکے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

بیم و امید میں رہے کیا کہیں کس طرح جیئے
حسرت و یاس ہی غرض عمر کے دن گنوا دیئے

ہاتھ اٹھا اٹھا کے ہم دل سے دعا کیا کئے
رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

لی ہیں جگر میں چٹکیاں طور جفا تو دیکھئے
مجھ کو جواب کیا دیا طرزِ ادا تو دیکھئے

کیسا حجاب اٹھا دیا شرم و حیا تو دیکھئے
غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے

سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

سکتے میں خاص و عام ہیں عیب خیال یار سے
ہونٹ سیئے ہوئے سے ہیں آج تو اہل بزم کے

حکم سکوت بھی ہمیں گو نہ دیا ہو شوخ نے
بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے

اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

کیا کہیں بزم یار میں بات ہی کچھ بگڑ گئی　　صفت میں ہو گیا مرن مدنظر تھی دل لگی
دیر تلک ہنسی رہی بات بن آئی غیر کی　　میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اسکو دکھاؤں عشق کا جوش و خروش کس طرح　　لائے زباں پہ حالِ دل شمع خموش کس طرح
شوق و ہوس کریں بیاں دیدہ و گوش کس طرح　　مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

آمد و شد وہاں جو تھی طبع اسی میں شاد تھی　　تا در یار ہو گزر دل کی یہی مراد تھی
خاک میں بھی اگر ملا خاک بھی وقفِ یاد تھی　　کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

عشق میں صدق ہو اگر اسکا مآل ہے وصال　　جزو جو کل سے جا ملا ہو گیا ایک ان کا حال
وہ سکون و اتحاد کیوں نہ ہو پھر یہ اتصال　　گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یوں تو ہیں ہند میں بہت فنِ سخن کے مدعی　　ہیں یہ جدا ہی بند شیں طرز ادا ہے اور ہی
حق تو یہی ہے میرزا ختم ہوئی سخنوری　　جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ردیف (و)

۶۸

کچھ بات ہو بطرز ملامت ہی کیوں نہ ہو عزت ہے ہم کو خواہ اہانت ہی کیوں نہ ہو
کچھ رکھئے ہم سے دل میں کدورت ہی کیوں نہ ہو وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ممکن نہیں ہے دل میں گزر انبساط کا دل میں وہ شوق و ذوق کہاں ارتباط کا
اب وہ نہ میں رہا نہ زمانہ نشاط کا چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی کا اپنی مجھے مل گیا صلہ ٹوٹا ہے التجائے اعانت کا سلسلہ
شکوہ کسی کا ہے نہ کسی کا مجھے گلہ ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

لیں چٹکیاں جگر میں جو مجھ سے کبھی ملا چھیڑا ہمیشہ شکوۂ دشمن کا سلسلا
کی بات بھی تو وہ کہ دیا جس نے دل ہلا ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلا
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

یکسوئی ہو بشر کو میسر یہ ہے محال اس کیلئے ہے خلوت و جلوت کا ایک حال

تنہا بھی ہو تو نفس سے رہتی ہے قیل و قال ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہم انقلاب سے متاثر ہوں کیا مجال ہرگز نہ لیں ہزار سبق دے جہاں کا حال
وارستگی میں رتبہ و غیرت کا رکھ خیال ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی جہان سے فرزانگی نہیں کیا رم ہے اور چیز جو دیوانگی نہیں
دنیا سے بھاگنا کوئی مردانگی نہیں وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

رکھتا ہے شاہراہِ فنا میں قدم کوئی ہوتا ہے محو دل سے خیالِ عدم کوئی
اس فکرِ جاں گداز سے چھٹتے ہیں ہم کوئی مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

کرنے پھریں رقیب چناں و چنیں اسد جاتے ہیں اسکے کوچے سے مرزا کہیں اسد
دیکھیں گے آپ قبر ہماری وہیں اسد اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

۶۹

ستایا تو نہیں میں نے کسی مرغ نوازن کو مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے دیکھیں اپنے دشمن کو

فغاں کرتا ہوں میں جب یاد کرتا ہوں نشیمن کو
قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

یہ مانا غیر صورت آشنا اس کا نہ محرم ہے
مگر یہ روسیہ اس کے تجسس میں تو ہر دم ہے
وجودِ غیر جب تک ہے تو مجھ کو کچھ نہ کچھ غم ہے
نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدا یا آرزوے دوست دشمن کو

بھر آیا بخیہ گر کا دل بھی ظالم میری حالت پر
اثر ڈالا نہ اس منظر نے بھی تیری طبیعت پر
ہنسی آتی ہے مجھ کو تیرے دعوائے محبت پر
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

ہوئی ہے کیا بلا دیوانگی عشقِ پریوش میں
کریا رائے سکوں مطلق نہیں قلبِ مشوش میں
جنوں کی حرکتیں قائم ہیں گو ہوں حالتِ غش میں
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ہم اپنا غرقِ خوں ہونا بجا آساں سمجھتے ہیں
رواں ہونا گلے پر تیغ کا آساں سمجھتے ہیں
نکلنا جانبِ مقتل ترا آساں سمجھتے ہیں
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

رہا دستور آہن سے سناں و تیر بننے کا
ہمیشہ مادہ اس میں رہا شمشیر بننے کا
زمانہ اب ہے اس کے لائقِ توقیر بننے کا
ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

مجھے کیا اس سے ابرِ تر گھرے یا گھر کے کھل جائے　　دُرِ خوش آب پانی کی جگہ یا روز برسائے
سیہ بختی سمجھتا ہوں اگر کالی گھٹا چھائے　　خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

زہے قسمت کہ اسکے سامنے تمثالِ جاناں ہے　　بتوں کو جان کر سکّانِ کعبہ دل سے قرباں ہے
اگر دیکھیں حقیقت میں تو وہ پکا مسلماں ہے　　وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

پھرایا سر بکف شوقِ اجل نے چار سو مجھ کو　　لئے پھرتی تھی در در جاں دہی کی آرزو مجھ کو
رہی جلاد ہی کی زندگی بھر جستجو مجھکو　　شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

جو ہوتا مال میٹھی نیند کیونکر خاک پر سوتا　　زر و گوہر کے ہوتے کس طرح ٹھنڈے جگر سوتا
متاعِ رفتہ رہ جاتی تو پھر کیا بے خطر سوتا　　نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مضامیں کے خزینے ہیں بنتے ہیں سینے میں شاعر کے　　خزینہ دار و مالک ہیں سخنوران ذخائر کے
گہر کی قدر کیا ہے سامنے الفاظِ نادر کے　　سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

درِ اقدس کا اک دربان ہے فغفور چین غالب　　سکندر کو ہے فخرِ آستاں بوسی یہیں غالب
اسی دروازہ پر گھستا ہے مرزا کی جبیں غالب　　مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدوں و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

(۵۰)

سنکر سنانی سُن ہوئے اس خستہ تن کے پانوٗ
جاتا کہاں کہ ہو گئے ایک ایک من کے پانوٗ
کیا جانتا تھا وہ نہیں چھوٹے سخن کے پانوٗ
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانوٗ
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانوٗ

جی میں ہے پوجئے بت نازک بدن کے پانوٗ
جیسے پجاری پوجتے ہیں برہمن کے پانوٗ
ہاتھ آئیں کس طرح مگر اس پُرفتن کے پانوٗ
دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس سیم تن کے پانوٗ
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانوٗ

کہتے تھے اپنے نفس کو ہم نا سزا ہے یہہ
بچتے تھے اس کے سایہ سے گویا بلا ہے یہہ
امّارہ اب ہمارے لئے ہو گیا ہے یہہ
بھاگے تھے ہم بہت سو اب اسکی سزا ہے یہہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانوٗ

سارا بدن ہے فرطِ جراحت سے چور چور
عاجز ہوں دوا و دوش سے تو کیا قصور
جرّاح کچھ علاج تو ان کا بھی کر ضرور
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانوٗ

صد چاک دل ہے صورتِ صد برگ و چار برگ
صحرا میں تھا نہ کچھ بھی غمِ برق و تگرگ
پھر ہو چلا ہے قبر میں وحشت کا ساز و برگ
اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانوٗ

گلبن کی شاخ شاخ ہوئی جام گل بکف
ہیں قمریوں کی تاک میں سب بہ روصف نصف

کس کس کی جان دیکھئے اِسسال ہو تلف
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف

اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانوٗ

ناز و نزاکت ایسی بھی دیکھی سنی نہیں
رفتار کے خیال سے تھکتا ہے وہ حسیں

ظاہر ہیں سب تکان کے آثار ہمنشیں
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں

دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانوٗ

ایسا سخن شناس تو شاید سنا نہ ہو
بڑھ کر سخن ظفر کا جو لب چاٹتا نہ ہو

مرزا یقین کیوں مجھے اس قول کا نہ ہو
غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو

پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانوٗ

۷۱

یہ قدمِ رنجۂ پا کیا کوئی کم ہے ہم کو
ان کا لانا ہی سرِ بزم کرم ہے ہم کو

خاک بوسی کا عجب شوقِ اتم ہے ہم کو
واں پہونچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

سر میں سودائے چمن ہے نہ ہوائے گلشن
تیرے در سے ہے ہمیں پانو اٹھانا بھی کٹھن

لاغری وہ ہے کہ اک بال ہیں گویا ہمہ تن
ضعف سے نقش پئے مور ہے طوقِ گردن

تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

آج ہمدرد زمانے میں کہاں پیدا ہے   ایک کا ایک کو ہو درد تو بے جا کیا ہے
غم سے جو واسطہ میرا ہے وہی دل کا ہے   دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے ؟
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

وائے غفلت کہ نہیں اتنی خبر بھی اب تو   سامنے کون ہے اور آپ نے دیکھا کس کو
ہم سے اب دیدہ و دانستہ ہوا غماض ہو جو   جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رہنے دیں دوست اسی طرح ہمیں گوشہ نشیں   سیرِ گلزار سے دل اور بھی ہوگا غمگیں
کھائیے زخم جگر پر یہ ہمیں تاب نہیں   رشک ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ چمن تیغِ دودم ہے ہم کو

صاف ظاہر ہے کہ وعدہ تھا مگر صاف نہ تھا   وقت اصرار کھلا آکے نتیجہ اس کا
ایسی قسموں کا بھروسہ ہمیں کیونکر ہوتا   سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

بے سبب اشکِ رواں کا تو نہیں باندھا تار   عین جوہر ہے یہ ان کا کہ ہوں آنکھیں خونبار
نہ ہو روئیں تو مژگاں پہ کہاں آئے بہار   دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

داخلِ شکوہ سمجھتے ہو جو خاموشی کو   حال کیا ہو جو کبھی نالۂ پُر درد سنو
کیا کریں چین کسی طرح نہ جب لینے دو   تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو

ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

۹ عقل حیران ہے کس وجہ سے چھوڑی دہلی — کچھ تو ہے جس لئے ٹھکی ہے مسافت اتنی
یک بیک چھوڑ دی کیوں الفتِ راحت گھر کی — لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھی دل میں یہاں رہنے کی لہر — بیٹھ رہنا ہے یہیں اور ترکِ سفر ہے اک قہر
قصد ہے دور کا مانع جو نہ ہو گردشِ دہر — مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر

عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

آپ کی طرح ہے مرزا بھی کرم کا طالب — دل کھنچا جاتا ہے اربابِ کرم کی جانب
وجہِ نقل و حرکت کیا کہوں مرزا صاحب — لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

(۷۲)

کیا قابل خطاب وہی روسیاہ ہو — مجھ پر نہ بھول کر بھی کرم کی نگاہ ہو
چاہو اسی کو دل میں اگر اس کی چاہ ہو — تم[۱] جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

---

[۱] غالب صاحب نے نواب علائی کو ایک خط میں لکھا "اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں۔ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا بھٹی کرتا تھا خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف بھٹی متروک نہ غزل نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین نہیں پھر کہو کیا لکھوں۔ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو (باقی صفحہ ۱۳۱ پر)

الزام رکھ کے غیر پہ کیا صاف ہوگئے — گویا یہ خون ہی نہیں ذمے جناب کے
فرماتے ہو کہ قتل کیا تجھ کو غیر نے — بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

جس طرح قتل و خوں میں جسس بے ہراس ہیں — کیا وہ بھی یوں ہی دشمنِ جانِ اناس ہیں
کیا یوں ہی ان کے شیفتہ بھی وقفِ یاس ہیں — کیا وہ بھی بے گنہ کشِ حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

محفل تمام شوق [illegible] میں ہے بے قرار — تکتے ہیں غیر بھی نگہِ بد سے بار بار
یہ رشک کس طرح نہ کرے مجھ کو دل فگار — ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

رکتا نہ میکدہ سے تو رکتا جگہ کی قید — آزاد کے لئے نہیں زیبا جگہ کی قید
وارستگی بہانہ ہے تو بے جا جگہ کی قید — جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

باقی [۲۹] [illegible] ۔ [illegible] اطراف و جوانب سے استعانتاً جاتے ہیں اصلاح یا جاتے ہیں باور کرنا اور مطابق واقع سمجھنا تمہارے، دیکھنے کو دل رستا یا ہشاشت اور تمہارا موقوف [illegible] پر ہے کہ تم یہاں آؤ، کاش اپنے والد ماجد کیساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے [illegible] تم جاؤ تم کو غیر سے جو رنج [illegible] ہے۔ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے۔

[۱] حالی نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے کہ مسجد و مدرسہ و خانقاہ مساوی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف [illegible] وہی چھوٹ گیا تو مسجد مدرسہ اور خانقاہ میں بیٹھ کر پی لینے میں کوئی عار نہیں ہے یعنی یہ مقامات اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔ مرزا غالب شوخی برتنے سے کبھی نہیں چوکتے یعنی مسجد مدرسہ [illegible] خانقاہ جائے عزت ہیں مگر غالب صاحب نے ان سب کو مساوی سمجھ لیا ہے۔ ۱۲

ہر چیز باغِ خلد کی ہے منتخب درست — حور و قصور و شہد انار و عنب درست
مشہور ہے کہ ہے وہ مقامِ طرب درست — سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

سونا نہ ہوگا دیس اگر ہم نہ ہوں کہیں — ذاتی نہ کوئی گھر ہے نہ گھر کی کہیں زمیں
مرزا وجود شاہ ہے رونق فزائے دیں — غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

۷۳

تمھیں نہ ضبط سے جب کام لو تو کیونکر ہو — تمھیں نہ فرصتِ تدبیر دو تو کیونکر ہو
اب اس سے حضرتِ دل بات ہو تو کیونکر ہو — گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

حصول وصلت و دیدار تو ہے امر محال — فقط ہے باعث تسکین تصور تمثال
امید و یاس کو سمجھا ہے آرزو کا مآل — ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

کبھی خیال کا اظہار مدعا کیجئے — کبھی یہ وہم کہ ہرگز نہ یہ خطا کیجئے
کہاں تک اپنے مقاصد کا التوا کیجئے — ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجئے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

تمھارا دل ہے کہ رشک و حسد کا گنجینہ　　بھرا ہی رہتا ہے بغض و نفاق سے سینہ
یہاں تک اپنے مقابل سے ہے تمھیں کینہ　　الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ　۳

جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

وہ رشکِ مہر رہا رات بھر تو جلوہ نما　　نمود ہونے نہ پائی سحر کہ چل نکلا
مری نگاہ میں اندھیر کیوں نہ چھا جاتا　　جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا

وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

[illegible] ہم نے بوسہ لیا　　تو تم نے غایتِ نخوت سے سر کو ٹھکرایا
نہ شرم کچھ تمھیں بندوں کی ہے نہ خوفِ خدا　　تمھیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا

بتوں کی ہو جو تمھاری سی خو تو کیونکر ہو

[illegible] گے حضرتِ دل خاک وہ تمھاری قدر　　ہوئی نہ کچھ بھی ہماری سوائے خواری قدر
[illegible] ہوں وہاں ہم جسے اپنی ساری قدر　　ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر

ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ہمیں تو آیہ قرآں تھا جو مضموں تھا　　بجا ہے ہم نے جو پڑھ کر کہا ہے آمنّا
وفا ضرور کریں گے وہ وعدہ فردا　　غلط نہ تھا ہمیں خط پر گمان تسلی کا

نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

سکوں سے کام نہ لوں اضطراب ہیں تو قصور　　مگر ہوں ضبط میں اس اضطرار سے معذور
زمانہ بھر میں نہ مرزا سا پائے گا صبور　　مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور

فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو　　(لہ حاشیہ ص ۱۳۲ پر)

(۶۴)

جو تاب ضبطِ غم ہو اشک آنکھوں سے رواں کیوں ہو ‏ ‏ کسی سے دل کی بیتابی کا در پردہ بیاں کیوں ہو
جو ہو درد آشنا تو شکوۂ دردِ نہاں کیوں ہو ‏ ‏ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر سینہ میں ہاں کیوں ہو

وہ ہر اک سلسلہ توڑیں تو ہم کب تک اسے جوڑیں ‏ ‏ رہیں ہم محوِ نظارہ کہاں تک جب وہ منہ موڑیں
خفا وہ ہیں اگر ہوں ہم رشتہ تمکیں کو کیوں توڑیں ‏ ‏ وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبکسر بنکے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

چھپا رکھا تھا ہم نے اپنے دل میں رازِ الفت کو ‏ ‏ نہ کی اُف جبر و استقلال سے جھیلا ہر آفت کو

حاشیہ صفحہ ۱۳۲ کا:- یہ غزل اودھ اخبار لکھنؤ کے ساتھ دہلی کے اردو اخبار میں چھپی۔ جب قلعۂ معلیٰ میں مشاعرہ ہوا تو اسمیں یہ غزل غالب صاحب نے پڑھی۔ غزل کیلئے طرح ہمیشہ بادشاہ ظفر دیا کرتے تھے۔ مقطع میں غالب نے بادشاہ کے طرحی مصرع کو اس طرح نظم کیا ؂ مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقول حضور ۔" فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو"۔

لہ مرزا غالب نے حاتم علی مہر کو لکھا کہ میں نے ان دنوں دو غزلیں لکھی ہیں۔ ایک تو مدعا نہ ہو سو وہ آپ کے پاس بھیج چکا ہوں۔ دوسری غزل زمان کیوں ہو گماں کیوں ہو اب بھیجتا ہوں۔ نیز دوسرے خط میں انھیں کو لکھا:-

"تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بیدرد پر دل آیا ہے تو شکایت کی گنجائش نہیں ہے بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستاں درخورِ افزایش ہے بقول غالب ؂

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو ‏ ‏ نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

ہے ہے یہ شعر ؂

بہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ‏ ‏ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

خبر کیا تھی ہمارے دردِ پنہائی کی خلقت کو　　کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

نہ کرنے دے ہمیں وحشت میں سجدہ اپنی چوکھٹ کا　　پہاڑوں تک کرے گا رہبری سودائے سر اپنا
ہمیں ہے کچھ نہ کچھ تو چارۂ جوشِ جنوں کرنا　　وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

کل وہ سرور رہا جس کا مفصل ذکر کر ہمدم　　کہا دل کر کے سب حالات مجھ سے کہہ گزر ہمدم
یہ پہرے پوچھنے پر تو نے تھا مانگوں جگر ہمدم　　قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نظر بندی یہ کیسی ہے معما کیا ہے سمجھاؤ　　طبیعت کو عجب الجھن ہے اس گتھی کو سلجھاؤ
اگر پردہ نہیں حدِ نظر تو سامنے آؤ　　یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں لیکن یہ بتلاؤ
اگر دل میں نہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

کچھ ایسا ہی ہر انساں کی طبیعت کا تقاضا ہے　　کہ یہ اپنی خطا کو غیر کے سر ڈال دیتا ہے
ہمیں ٹھہرے گنہگاروں میں یہ انصاف اچھا ہے　　غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ رخ کا آئینہ دنیا کی حیرانی کو کیا کم ہے　　پریشاں زلف. عالم کی پریشانی کو کیا کم ہے
نگاہِ تیز جانبازوں کی قربانی کو کیا کم ہے　　یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

عنایت تم نے کی جس پر اسی کا ناک میں دم ہے	ہوئے غمخوار جس غمگیں کے تم وہ طعمۂ غم ہے
تمھاری مہربانی میں بھی جلادی کا عالم ہے	یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

مصیبت رشک کی ظلم عدو دن رات سہتے ہیں	تمہاری مہربانی سے پریشاں حال رہتے ہیں
ہنسی سوجھی ہے تمکو اشک یاں آنکھوں سے بہتے ہیں	یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں

عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

ابھی آئے ابھی جاتے ہو جانا کس کو کہتے ہیں	یہ آنا ہے تمھارا۔ تو نہ آنا کس کو کہتے ہیں
کرم سمجھا ہے اس کو۔ تو جلانا کس کو کہتے ہیں	یہی ہے آزمانا۔ تو ستانا کس کو کہتے ہیں

عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

جو کہتا تھا بری ہے غیر کے گھر محفل آرائی	تو ہنس کر ٹالتے تھے مجھکو ٹھہراتے تھے سودائی
لگے اب بحث بھی کرنے جتا کر اپنی دانائی	کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی

بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہنا کہ ہاں کیوں ہو

چلا جادو نہ جب مرزا کا اسکے روبرو غالب	کرے گی کیا اثر پھر خاک تیری گفتگو غالب
سر بزم اس سے ہے بے فائدہ کیوں قید و غالب	نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

ردیف (ی)

۷۵

سب ملتوں کے ساتھ مراعات چاہیئے — آپس میں اتحاد ہو وہ بات چاہیئے
رندی و زاہدی میں مساوات چاہیئے — مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

رُخ کے قریب زلف کی ظلمات چاہیئے — دن سے ملی جلی ہوئی یہ رات چاہیئے
ہنسنے کا اس کی ضد ہی سے اثبات چاہیئے — مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

مصروف آپ مشق جفا میں تھے عمر بھر — مطلق نہ تھی کسی دل مظلوم کی خبر
بیٹھے ہیں اب تو ہاتھوں تھامے ہوئے جگر — عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

جرأت تو دیکھ اس دل کوتاہ دست کی — اس نامراد نے کبھی ہمت نہ پست کی
اب غم ہے نیست کا نہ خوشی اس کو ہست کی — دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیئے

صورت کو ان کی روح جب اپنی ترس گئی — تدبیر کارگر نہ ہوئی کوئی دید کی

اس سے زیادہ شکلِ رسائی کوئی نہ تھی — سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

یہ لوٹتا ہے ثروت و اقبال و جاہ کو — کرتا ہوں غافل اس سے دل عیش خواہ کو
سمجھا نہیں ثواب کبھی اس گناہ کو — مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

بے کار شے ہیں ہم وہ محرک اگر نہ ہو — ق — مرزا یہ راز وہ ہے جو پاتے ہیں راز جو
ہستی کا سب ظہور عدم سے ہے جان لو — نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

ہر باغ کی ہے باغِ جہاں میں فضا جدا — ہر گلستاں نے پائی ہے آب و ہوا جدا
ہر گل کی بو جدا ہے روش اور ادا جدا — ہے رنگ لالہ و گل و نسرین جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر میں اگر خودی ہے نہ لے نام بے خودی — خود بیں ہے تو نہ کر ہوسِ خامِ بے خودی
کر سجدہ شکر کا جو ملے جامِ بے خودی — سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بے خودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

قائم ہو ایک حال پہ کس طرح آدمی — کرنی ہے راہ طے اسے جذب و سلوک کی
ہر فعل کی ہے حالتِ موجودہ مقتضی — سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بے خودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

خالی نہ ہو حقیقتِ عرفاں سے کوئی بات　　　انساں حرف حرف سے پیدا کرے نکات
نظارۂ صفات سے ہوجائے محوِ ذات　　　یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیئے

(٧٦)

ذراسی جان تن میں ہے فدا کرنے کو ہوں وہ بھی　　　رگوں میں جو لہو تھا ہے سرشک لالہ گوں وہ بھی
جگر رکھتا تھا لیکن اب ہے پامالِ زبوں وہ بھی　　　بساطِ عجز میں تھا ایک دل اک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

یہ کیا کم مہربانی ہے کہ ٹالا بات کو اس نے　　　وگرنہ مفت میں لینے کے دینے پڑ گئے ہوتے
خدا نا خواستہ دل سے نہ وہ روٹھا نہ ہم روٹھے　　　رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

نکالے کون سے ارمانِ دل آخر مقدر نے　　　کہ ہم ہوں منتظر پیکِ اجل کی آمد آمد کے
طبیعت کو ذرا الجھاؤ سلجھے اس تصور سے　　　خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

سرشکِ خوں بہانے سے تو تھا یہ مدعا ہمدم　　　کہ دل کی آگ اس پانی سے کم ہوگی ذرا ہمدم
مگر اس سے تو سوزِ قلب دونا ہوگیا ہمدم　　　نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

بھلا ہے زور بازو پر جہاں تک اپنے اتراؤ　　کرو تعریف اپنی سرخرو اس کو نہ ٹھہراؤ
سر مقتل زیادہ اس کے جوہر کو نہ چمکاؤ　　نہ اتنا برش تیغ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

توقع کیا سوال اس سے اگر اک دور کا کیجئے　　مناسب ہے کہ اشک حسرت و ارماں پیا کیجئے
سبو خالی دکھاتا ہے جو عرض مدعا کیجئے　　نے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

امید و بیم میں مرزا ہوا اک مدت سے سرگرداں　　نہیں ہونے میں آتا اس سے ملنے کا کوئی ساماں
کسی صورت پہ مشکل دیکھئے ہوتی بھی ہے آساں　　مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوہ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

(۷۷)

نکالے گی نہ چکر سے ہمیں گردش زمانے کی　　یہ گردش جس قدر بھی ہے سزا ہے دل لگانے کی
زمیں پر اب کوئی صورت نہیں آرام پانے کی　　غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اسے اپنی تپش کا حال کچھ لکھ تو دیا یارب　　مگر خط کو مرے وہ پڑھ بھی لے امید کیا یارب
جلا ہی دے کہ سوز دل تو ظاہر ہو ذرا یارب　　کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

اگر ہے آہ آتشبار نالہ آتش افشاں ہے — نہیں چارہ کہ عالم آشکارا رازِ پنہاں ہے
دباؤں یہ دہکتی آگ کیونکر عقل حیراں ہے — لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
بڑی مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

کوئی بے کار ان کا جانب گلزار جانا تھا — گلستاں کو مگر اس رنگ سے مقتل بنانا تھا
گلوں کو بھی تو اپنے زخم خوردوں میں ملانا تھا — انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

مقدر ہی میں تھا کچھ تجھ سے افسوں ساز پر مرنا — بدانجامی تھی اپنی خوبیٔ آغاز پر مرنا
مناسب تو نہ تھا اس ظاہری انداز پہ مرنا — ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

غمِ دوراں کے شکووں سے حقیقت کھل گئی اپنی — طبیعت کی وہ قوت اور وہ جولانی غلط نکلی
حسینوں کی اٹھائے بات کس کو تاب ہے اتنی — لگدکوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

زمانے میں نہیں سچی محبت کا نشاں غالب — جنھیں کہتے ہیں مخلص دوست وہ اب ہیں کہاں غالب
بیانِ حال میں قاصر ہے عاجز کی زباں غالب — کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

(۷۸)

زنداں سے بھی زیادہ برا یہ مکان ہے
اک قید میں پڑے ہیں مصیبت میں جان ہے
یہاں نقطۂ خیال زمیں کا نشان ہے
کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

سیارے گھومتے ہیں فلک پر تیرے لئے
اسباب اور کچھ بھی نہیں ان کی سیر کے
چکر دیئے ہیں چرخ کو تیری تلاش نے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

بے چارہ دل حوادثِ دنیا سے ہے بہ تنگ
ہو کیوں نہ چور چور کہ کھایا ہے سخت سنگ
اس سنگ زن کے وہم سے ہے میری عقل دنگ
حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

اپنا تو دل تھا آگ سے گویا بھرا ہوا
کرتا قیام پھر وہ اس آتش کدے میں کیا
خالی تھا سوزِ عشق سے ہاں دل رقیب کا
کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کچھ بات جھک کے کان میں کہنا بہانہ تھا
آخر کوئی سبب بھی تھا دامن کی آڑ کا
اب تم ڈھٹائی سے تو نہ جھٹلاؤ برملا
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

آنکھیں لگی ہیں جانبِ در انتظار میں　　تصویر سا خموش ہے شوقِ نگار میں
آیا ہے گشت کر کے ابھی خارزار میں　　بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

غم نے لہو پلانے کا اچھا صلا دیا　　اک داغِ جاں گداز جگر پر لگا دیا
اس داغ نے تمام جگر کو جلا دیا　　ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

اس پر جو ڈالتے نہیں وہ قہر کی نظر　　ظاہر ہوا نہیں ہے بھروسہ رقیب پر
مرزا کا بخت یاور یاری ہے سر بسر　　ہے بارے اعتمادِ وفاداری اسقدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

۹

یا تو میں کرتا تھا غمت آہ و زاری ہائے ہائے　　اور نہ کرتا نہ تھا کچھ غم گساری ہائے ہائے
یاد ہم آخر جتائی شرطِ یاری ہائے ہائے　　در سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

دل کا دل ہی میں رہا کچھ بھی نہ نکلا حوصلہ　　پست ثابت ہو گیا الفت میں تیرا حوصلہ
منہ چھپایا مجھ سے بس اتنا ہی ملا کیا حوصلہ　　تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

عہد تجھ سے زندگی بھر کے لئے لے تو لیا　　کیا خبر تھی زندگی نکلے گی تیری بے وفا
سامنے آیا مری تقدیر کا لکھا ہوا　　عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا

عمر کو بھی تو نہیں تھی پائداری ہائے ہائے

اُٹھ چکے ہیں جب کہ سامان بقائے زندگی　　ہو پھر اس سے کیا خوشی کیا دل کو بھائے زندگی
کون مر مر کر جئے چوٹھے میں جائے زندگی　　زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی

یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

نازکی سے یاد مکتا تھا ترا رُخ پھول سا　　صورتِ برگ خزاں یا اب ہے مرجھایا ہوا
کس ہوا نے اے گلِ تر تجھ کو پژمردہ کیا　　گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا

خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

تجھ کو رہنا تھا ہمارے دیدۂ نمناک میں　　یا مناسب تھا بنانا گھر دل صد چاک میں
خوبشتن داری سے تیری آگیا دم ناک میں　　شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں

ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

کامیابی اب کہاں وہ بات ہی اے دل گئی　　وہ بہارِ عاشقی وہ رونقِ محفل گئی
عہد لینے کی وہ ساری سعی لاحاصل گئی　　خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی

اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

منہ چھپایا خاک میں کیوں آخر آیا کیا خیال　　کیا کسی پر ہو گیا ظاہر ترے دل کا خیال
جب کہ رسوائی کا تھا ظالم تجھے اتنا خیال　　کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال

دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

اوچھے اوچھے وار جب اس نے لگائے بار ہا
دکھ گئی نازک کلائی اور بازو شل ہوا
پھر بھلا کس طرح نکلے اپنے دل کا مدعا
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا

دل پر اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

کر دیا ہے بے طرح رنج والم نے خستہ حال
موت کا آنا کٹھن ہے اور جینا ہے وبال
صبح کرنا شام کا فرقت زدہ کو ہے محال
کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشگال

ہے نظر خو کردہ اختر شماری ہائے ہائے

کون ہے اب سننے والا کس سے کہئے اپنا حال
دور کیجئے کس کی صورت دیکھ کر دل کا ملال
کوئی دیکھے تو مری حرماں نصیبی کا کمال
گوش محرومِ پیام و چشم محرومِ جمال

ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

نام گو مشہور دنیا میں ہوا ہے نام و ننگ
حال مرزا دیکھ کر اہل جہاں ہوتے ہیں دنگ
دل میں باقی تھی ابھی صحرا نوردی کی امنگ
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ

رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

۸۰

کیوں قیدِ زندگی سے دل اتنا اداس ہے
جب اس سے چھوٹنا ہے تو پھر کیا ہراس ہے
کہتے ہیں جس کو موت وہ ہر وقت پاس ہے
سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

پھرتا ہے رات دن یہ پریشان اِدھر اُدھر
اس کو نہیں قیام کبھی ایک حال پر
وحشت زدہ کے حال سے اور غفلت اسقدر
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

جنات کو دکھائی نہ اس درد کی جھلک
محروم اس مزے سے رہے سر بسر ملک
ہوں اس عطائے خاص سے منت کشِ فلک
کیجئے بیان سرورِ تپِ غم کہاں تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

ہوتا ہے صحبتوں ہی سے انسان بُرا بھلا
صحبت ملی بھی اس کو مگر کیا اثر کیا
ہونا تھا آشنائیِ دل سے حق آشنا
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

سودائی ہیں وہ جنکو ہے صہبا سے اجتناب
انساں کو چاہیئے کہ پیئے جائے بے حساب
کرتا ہے خوب جذب رطوبات آفتاب
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

مرزا پھرا ہے دشت میں چاروں طرف اسد
رونق فزا وہاں ہے درختوں کی صف اسد
دُرِ ثمیں ہے باعثِ قدرِ صدف اسد
ہراک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

گردش کا میری اور ہی کچھ رنگ ڈھنگ ہے　　گردوں بھی دیکھ کر مری حالت کو دنگ ہے

جوشِ جنوں میں یہ تکٔ و دو کی امنگ ہے　　وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے

دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

مرزا کی طرح نفس کو سمجھائیو اسد　　اس خواب پر نہ بھول کر اترائیو اسد

دھوکہ نہ وا ہمہ سے کہیں کھائیو اسد　　ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

۸۲

غیر سے تجھ کو محبت ہی سہی　　تجھ سے اغیار کو الفت ہی سہی

مجھ پہ اغیار کو سبقت ہی سہی　　عشق نے تو نے تجھ کو وحشت ہی سہی

میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

کونسی ایسی خطا کی ہم نے　　جس سے لائق نہ رہے محفل کے

حاشیہ شعر ۱۴۶ کا :- مشکیں لباس کعبہ ۔ کعبہ کو سیاہ خوشبودار غلاف ۔ نافِ غزال ایک خاص قسم کا ہرن جس کی ناف سے مشک نکلتا ہے اسے نافۂ غزال کہتے ہیں ۔

نافِ زمیں ۔ زمین کا مرکز ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیغمبر خدا صلعم کے داماد تھے ۔ اور ان کے خلیفہ بھی ۔ غالب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں یہ بات مشہور ہے کہ کعبہ وسط میں ہے یعنی زمیں کا مرکز ہے لیکن یہی بات نہیں کہ وہ نافِ غزال بھی ہے ۔ حضرت علی رضی کی مہربانی سے کعبہ کے غلاف کی خوشبو تمام دنیا میں پھیل گئی ہے ۔

سلسلہ کچھ تو لگائے رکھئے قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہے کہاں کی یہ بھلا دانائی کیوں ہے مرغوب تمہیں تنہائی

نہ جنونی ہوں نہ میں سودائی میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی

اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

عالم کن کو دبستاں سمجھو اس سے ملتا ہے سبق انساں کو

بھول کر غیر کا احساں نہ لو اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

ہے کہاں مثلِ شرر اسکو قیام گرم رفتار یہ رہتی ہے مدام

نہ توقف ہے نہ دم بھر آرام عمر ہر چند کہ ہے برق خرام

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

رات دن عشق کا دم بھرتے ہیں رنج و ایذا سے نہیں ڈرتے ہیں

ان پہ مرنے کے لئے مرتے ہیں ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں

نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

---

[1] ایک حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچاں لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ یعنی اپنی ہستی ہی سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت غالب فرماتے ہیں جو کچھ حاصل ہو اپنی ہی ہستی سے ہونا چاہیئے۔ اگر اپنی ہستی سے معرفت حاصل نہیں ہو سکتی تو اپنی ہستی سے غفلت ہی حاصل کرنا چاہیئے۔ خودی مٹی جب ملی خدائی۔ حاصل کلام یہ کہ دوسرے کا احسان نہیں اٹھانا چاہیئے۔

شاد ہیں دور میں تیرے اجلاف　　اور ناشاد و حزیں ہیں اشراف
اس قدر دین نہ ہوگی اسراف　　کچھ تو دے اے فلک ناانصاف
آہ و فریاد کی فرصت ہی سہی

ہجر میں غم کو ترے پالیں گے　　داد بھی اس کی کبھی پالیں گے
جس طرح ہوگا یہ دن ٹالیں گے　　ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

کیا عجب ہے کہ وہ شرمائے اسد　　کچھ کرے رحم ترس کھائے اسد
یہی مرزا کی بھی ہے رائے اسد　　یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۸۳

آوازے رات غیر سحر تک کسا کئے　　دل کھول کر مذاق برابر کیا کئے
پاکر خموش مجھ کو جو چاہا کہا کئے　　اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

بن کر فقیر میں ترے در پر اگر گیا　　دربان مجھ کو دیکھ کے غصے میں بھر گیا
چپ چاپ میں جو تیری گلی سے گزر گیا　　دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بے صدا کئے

آئی ہے پھر چمن میں بہارِ خجستہ پے — اِس میہماں کی مجھے خاطر عزیز ہے
قصہ ہوا ہے زہد و ریائی کا آج طے — رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن[1] ہے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

ہو دستیاب آدمی کو گرچہ عمرِ خضر — لاکھوں ہی پائیں ایک نہ دو گرچہ عمرِ خضر
دانا کبھی نہ لے اسے دو گرچہ عمرِ خضر — بے[2] صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

سچا امین اس کو سمجھتے رہے فہیم — سب مال اس نے ہضم کیے بے ہراس و بیم
اب وہ جواہرات کہیں ہیں نہ زر نہ سیم — مت ور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

ذلت ہے ہماری [illegible] کی جستجو — پھرتے ہیں مارے مارے تجسس ہیں کو بکو
بہتان اٹھاتے رہتے ہیں ہنگامِ گفتگو — کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

آخر پڑی کہاں سے اے ہمنشیں یہ خو — ہرگز کسی حسین کو زیبا نہیں یہ خو

---

[1] خرقہ و سجادہ۔ یعنی گودڑی و مصلےٰ، دونوں کو رہن رکھتے پھرتے ہیں۔ دوسرے موسم بہار کی جس نظر سے گونا داری ہے پھر دونوں چیزوں سے یہ کام لیتے ہیں۔ خوب شوخی دکھلائی ہے۔

[2] حضرت خضر عمرِ جاوداں رکھتے ہیں طنز کیا گیا کہ وہ بھی قیامت کے روز یہی کہیں گے کہ ہم نے کچھ نہ کیا بے صرفہ عمر گزار دی۔ عمر کے متعلق ایک اور شعر بھی کہا ہے ؎

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

رکھتا تھا پیشتر تو نہ وہ مہ جبیں یہ خو — صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے

آنکھوں میں یوں تو اور بھی دنیا میں نازنیں — لیکن نہیں ہے سادہ دل ایسا کوئی حسیں
چارہ پذیر ہیں تو اس کو کہوں گا نہ ہم نشیں — ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

مرزا نے عرضِ حال کا پایا جواب کیا — لو گے تم اپنی بات کا اچھا جواب کیا
چاہو نہ تم جواب تو اس کا جواب کیا — غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

۸۴

وحشت اثر حیاتِ جہانِ خراب ہے — مثلِ شرر قیام کی یہاں کس کو تاب ہے
اس رہ گزر میں جو ہے وہ پا در رکاب ہے — رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

اس بزم میں ہیں رنگ نرالے بہار کے — ہر جام پُر شراب گلِ تر ہے دیکھ لے
مرغِ چمن کا ہے بطِ مے پر گماں مجھے — مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

تھا دل کو شوق اک نگہِ التفات کا — معلوم تھا نہ حال ان آنکھوں کی گھات کا

ملے ایک نیر میں ہوا قصہ حیات کا زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

دہرِ خراب میں ہے خرابات کی صفت مژدہ ہو مے کشوں کو نو مستو نکو تہنیت
جاگیر یہ وہ ہے کہ انھیں کو ہے تولیت ہمادا و بادا نوشیِ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

تارِ نظر کو کرتی ہے اس کی چمک فنا اس پر نگاہ ڈالے کسی کو ہے تاب. کیا
آساں نہیں ہے مہرِ درخشاں کو دیکھنا نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

پہلے ہی کچھ تو شوق میں تھا حالِ دل زبوں دیدار سے تو اور بھی اس کا بڑھا جنوں
اب اور ہی کچھ اس کو تمنا ہے کیا کہوں میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہہ کامیاب ہے

جھڑتے ہیں پھول یوں تو لبِ راز دار سے مرزا یہ گل مرے لئے کیا کم ہیں خار سے
یہ اور بات چیت کرے اس نگار سے گزرا اسد مسرت پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

(۸۵)

وہ اگر میری تمنا پر ترس کھا جائے ہے سامنے آنکھوں کے برقِ حسن چمکا جائے ہے

دیکھنا[1] قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے	خود بخود آنکھوں کے آگے تیرگی چھا جائے ہے

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

لا نہیں سکتی ہے ہرگز تابِ آتش کوئی شے	ہوتے ہی دو آتشہ تیزاب ہو جاتی ہے مے

سوزِ پنہاں بڑھ کے خود بخود کر دیگا طے	ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

تھا مناسب کوئی تدبیر ایسی دشمن کی کرے	گفتگو میں تا نہ وہ ہر بار بے باکی کرے

کیوں نہ دل اسکا بڑھے جب در گزر اتنی کرے	غیر کو کیونکر وہ یا رب منع گستاخی کرے

گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

صبر کب تک کیجئے اور کب تلک غم کھائیے	تا بکے حالِ دلِ پُر درد سے دکھ پائیے

دل کو ضبطِ نالہ کی تدبیر کیا بتلائیے	شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے

دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

کیا مسرت خیز ہے اے دوست تیری بزمگاہ	تو جہاں ہو پھر وہاں غم پا نہیں سکتا ہے راہ

واہ ہوتی ہے وہاں جا کر اگر کرتا ہوں آہ	دور چشم بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ

نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

---

[1] حضرت غالب نے یہ ایک نیا مضمون باندھا ہے وہ غیروں کے بجائے اپنے آپ سے بھی رشک کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے محبوب کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر بھی رشک آجاتا ہے لہذا میں اِس رشک کی وجہ سے اس کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا ہوں۔

ایک اور شعر اسی مضمون کا ہے ؎ ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے ۔ مرتے ہیں ولے انکی تمنا نہیں کرتے۔

ہم یہ کب کہتے ہیں ظاہر ہو کوئی انداز عشق　　یا ہمیں دنیا کہے وارفتہ و جانباز عشق
کیا کریں جب بدحواسی اپنی ہو غمازِ عشق　　گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

دشمنوں کے حال پر وہ آج کل ہے مہرباں　　کچھ ہماری بھی سنے اتنی اسے فرصت کہاں
وہ ہے اور آٹھوں پہر اغیار کی دلداریاں　　اسکی بزم آرائیاں سنکر دلِ رنجور یاں
مثل نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

اک تو قدرت ہی نے اسکو نازنیں پیدا کیا　　اور اس میں تھا ہی کیا ناز و نزاکت کے سوا
اور سونے پر سہاگا عشق کا آنا ہوا　　ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

دیکھیے تصویر کی رنگینیاں بھی افسوں ساز ہیں　　اور عقیقِ لب میں تل بر جوہرِ اعجاز ہیں
اللہ اللہ ایک کھینچنے میں بھی سو انداز ہیں　　نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

رکھتے ہیں مجھ سے احبابِ وطن بغض و حسد　　دیکھئے اس بیکسی کی بھی کہیں ہوتی ہے حد
تیرہ بختی لائی ہے کیا رنگ اللہ الصمد　　سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

۸۶

جاں نثاری کی تمنا میرے آبِ گل میں ہے کچھ تمنا اور ہی لیکن دلِ بسمل میں ہے
کیا کروں تدبیر یارب جان اک مشکل میں ہے سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دل سے دل کو راہ ہے مجھ کو یقیں ہرگز نہ تھا گفتگو کی آج کچھ اس نے تو عقدہ کھل گیا
کوئی میرے جی سے پوچھے اسکی باتوں کا مزا دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

قطع مجھ سے کر چکے وہ دوستی کا سلسلہ ان کی بزمِ عیش کے قابل کہاں میں غمزدہ
پھر بھی ہر دم کچھ نہ کچھ رہتا ہے میرا تذکرہ گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

تو اگر چھا جائے گی ہم پر مصیبت ڈھائیگی جب نہ ہوگا شغل دل پر اک قیامت آئیگی
زندگانی بے مزہ کر کے مزا کیا پائے گی بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

ہم تو کرنے سر کے بل چل کر رہِ مقصود طے بیٹھنے کا ضعف کرتا ہے تقاضا پے بہ پے
پاؤں نے پکڑی زمیں زنجیر پا ہے کوئی شے رنجِ رہ کیوں کھینچئے واماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

دل رقیب روسیہ کا عیش کی منزل سہی ہم نے لوما ناکہ ہم جلنے ہی کے قابل سہی
سوزِ غم رگہائے تن میں خون کے شامل سہی جلوہ زارِ آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

تھا ترے نزدیک مرزا قابلِ قہر و عتاب پھر کیا اک بے گنہ کو کیوں گرفتارِ عذاب
اس مصیبت سے نکال اسکو کہ حالت ہے خراب ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

۸۷

خالی نہ تیری چشم کرم کی نظر گئی چمکی مثالِ برق ادھر آئی اُدھر گئی
سینے ہی تک نہ صرف یہ آکر گزر گئی دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

وہ دورِ جامِ مے ہے نہ وہ مے پرستیاں وہ بزمِ دل ربا ہے نہ ساقیِ دلستاں
سرخوش کہاں۔ خمار سے ہیں اب تو سرگراں وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

مدت سے آرزو تھی دل بے قرار میں پر ہوں تو اڑ کے جایئے بزمِ نگار میں
مر کر پہنچ گیا ہوں میں اس رہ گزار میں اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا۔ ہوسِ بال و پر گئی

کیوں کر لبھائے ہم کو نہ پروازِ نقشِ پا — گھر کر رہا ہے دل میں ہر اک نازِ نقشِ پا
دلکش ہے کتنی طرزِ فسوں سازِ نقشِ پا — دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

تھی خاص یہ روش کبھی مردانِ کار کی — یہ وضع ہر وضیع نے اب اختیار کی
جاتی رہی تمیز ہی اغیار و یار کی — ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

عالم ہی اور ہے ترے حسنِ شباب کا — مشکل ہے دیکھنا رخِ پر آب و تاب کا
بے سود و رائیگاں ہوا اٹھنا حجاب کا — نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

جانا وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر غضب ہوا — ہر چند تم نے وعدۂ فردا کیا تو کیا
دشوار ہو گیا دلِ مضطر کا تھامنا — فردو دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مرزا کی طرح دیکھتے تھے شادماں تمھیں — پیری میں بھی جہان نے پایا جواں تمھیں
لیکن غم و الم نے کیا خستہ جاں تمھیں — مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

اُس جذب کا ہمیں نہیں بے وجہ ادّعا　　تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا

فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

طے کی ہیں ان کے ساتھ بہت ہم نے منزلیں　　لیکن نہ پیشتر و کبھی مانیں گے ہم انھیں

اس رہ میں راہبر کی ضرورت نہیں ہمیں　　لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں

مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

نامِ خدا تم آج ہو ساقیِ بامِ جم　　اغیار اور حریف ہیں اس بزم میں بہم

دیتے ہو ہم کو مے تو نہ دینا کسی کو کم　　ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم

ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

مدت ہوئی ہمیں نہیں مذکور چند بد　　اس آستاں کے خاک نشینوں میں وہ بھی تھا

وہ بھی وہیں گیا جہاں ہو کر رہنما　　اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا

تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

۸۹

ہاں طاقت کچھ ناتوانی اور ہے　　اُس طرف زخمِ جوانی اور ہے

گر یہی نامہربانی اور ہے　　کوئی دن گر زندگانی اور ہے

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

ملہ حضرت جنوں بریلوی کو اس شعر کا مطلب یوں لکھا ہے "ایمیں کوئی اشکال نہیں جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتاتے کہ میں کیا کروں گا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجھے کر دکھانا ہے جانے شہر میں یا لواجے شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس۔"

میرے سینے پر ہے گل خن کا گماں ہے زبانِ شمع کی صورت زباں
کیا بتاؤں اپنے دل کی گرمیاں آتشِ[1] دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

ہم نشیں ان سے سفارش کیا کریں حکم یہ ہے نام بھی میرا نہ لیں
کیجیے اب کس طرح راضی انھیں بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

ایلچی کو کیا زوال اور کیا خطر صاف کہدے گالیاں دی ہوں اگر
ہو رہا ہے کیوں تامل اسقدر دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

دور میں ہیں چرخِ گرداں پر نجوم رات دن ہیں دائرِ محور نجوم
دہر میں ہیں وجہ خیر و شر نجوم قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

آچکا ہے غم قریبِ اختتام ٹوٹنے والا ہے کوئی دم میں دام
منتظر رہتا ہے مرزا صبح و شام ہو چکیں[2] غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

---

[1] نواب انوار الدولہ بہادر شفق کو لکھتے ہیں "یہ دن مجھ پر گزرتے ہیں گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبان بے پانی پینے والے جانوروں کا۔ خصوصاً اس تموز میں کہ غم و ہم کا ہجوم ہے ۔ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں [2] میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں " وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی کڑی ایسا قحط

(۹۰)

کچھ وہاں کی خبر نہیں آتی　　کیوں صبا راہ پر نہیں آتی
کوئی تدبیر کر نہیں آتی　　کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

چرخ آزار کے ہے کیوں درپے　　چین دیتا نہیں مجھے ہے ہے
ہوتی ہے اپنے وقت پر ہر شے　　موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دل ہی جب گم ہے دل لگی کیسی　　پاس تھا جب تو کچھ امنگ بھی تھی
کچھ ہمیں اب تو ہو گئے مٹی　　آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

حسن بندوں کا ہے ریاضت و زہد　　بندگی اور نیک سیرت و زہد
زیورِ عبد ہے عبادت و زہد　　جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

بقیہ صفحہ ۱۹۰: سخت کال ایسا پڑا، وبا کیوں ہو؟ "لسان الغیب" نے دس برس پہلے فرمایا ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی بعد رفعِ فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔

ہونے دو حسرتوں کا دلیں خوں　　وہ بگڑ جائیں گے اگر کہدوں
اپنے دل میں ہے اور ہی مضموں　　ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں

ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میرے نالے کہیں ٹھہرتے ہیں　　جا کے روزان کے کان بھرتے ہیں
خوش تو ہیں وہ مگر مکرتے ہیں　　کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں

میری آواز گر نہیں آتی

دکھ سے فرصت جو میں ذرا پاتا　　چیر کر سینہ تجھ کو دکھلاتا
عقل ہوتی تو خود سمجھ جاتا　　داغِ دل گر نظر نہیں آتا

بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہے شکایت عبث تغافل کی　　کیا کہیں کچھ خبر نہ اس نے لی
جب ہمیں خود خبر نہیں اپنی　　ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی

کچھ ہماری خبر نہیں آتی

روز کے غم سے جان پر ہے بنی　　یا رب اس سے نجات کب ہوگی
ہوگیا سیر زندگی سے جی　　مرتے ہیں[1] آرزو میں مرنے کی

موت آتی ہے پر نہیں آتی

---

[1] غالب صاحب نے لطیف بلگرامی کو لکھا ہے" محررا بکادو شنبہ" مولانا فضل حق ایسا دوست مرجائے غالب نیم مردہ نیم جاں رہ جائے ع مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی الخ. آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی الخ اگر جوان ہوتا او بیمار نہ آپ سے دعائے خیریت چاہتا اسّی برس کا مدت ہوئے آیا ہوں دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں (ماقی ص ۱۲۳)

ہوش میں تم جو آؤ گے غالبؔ　　پند مرزا سے پاؤ گے غالبؔ
حق کو کیا منہ دکھاؤ گے غالبؔ　　کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۹۱)

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے　　حاصل گریۂ و بُکا کیا ہے
اس تڑپنے سے مدعا کیا ہے　　دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہے یہاں دل کو شوقِ جلوۂ یار　　اور وہاں پردہ مانعِ دیدار
ان کو ہے بات بات پر انکار　　ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

غیر کب تک کہے گا حالِ دروں　　آپ کب تک سنیں گے یہ مضموں
ہو چکی انتہائے ضبط و سکوں　　میں[1] بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

باقی صفحہ ۱۶۲ :- شراب کمبخت اب بھی چھوٹتی نہیں۔ نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں۔ "جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد" "کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ" الخ

[1] میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میر مہدی و میر سرفراز حسین مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھا ہے۔ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے ماجرا یہ ہے کہ تمہارا بھی تو کوئی خط نہیں آیا میں جس کا جواب لکھتا۔"

کہتے ہیں واقفانِ غیب وشہود　　ایک ہیں عبد و عابد و معبود
آخر ان کا ہے اس سے کیا مقصود　　جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

جگمگٹے کیسے عاشقوں کے ہیں　　اور معشوق کس کو کہتے ہیں
حسن کے پھر یہ کیسے جلوے ہیں　　یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
عشوۂ و غمزۂ و ادا کیا ہے

ایک سے ایک نازنیں کیوں ہے　　دام بر دوش ہر حسیں کیوں ہے
فکر صیدِ دلِ حزیں کیوں ہے　　شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

کس لئے پھول رنگ لائے ہیں　　کیوں یہ لالے نے داغ کھائے ہیں
کس نے یہ تازہ گل کھلائے ہیں　　سبزۂ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہیں محبت کے بھی نرالے بھید　　آہ نغمہ ہے اس میں نالہ نشید
یاس کو مژدہ اور اجل کو نوید　　ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

دکھ کسی کو دیا تو کیا ہوگا　　تیرے حق میں بہت برا ہوگا
بد نتیجہ برائی کا ہوگا　　ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

کب یہ مکر اختیار کرتا ہوں　　کب دعا بار بار کرتا ہوں
طرزِ دشمن سے عار کرتا ہوں　　جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

مثلِ مرزا ہے گو ذہیں غالب　　شعر کہتا ہے دل نشیں غالب
ہے مگر رند بالیقیں غالب　　میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

۹۲

اے چارہ گرو تم انھیں سمجھا کے تو ہو آئے　　اور ساتھ لئے مژدہ آمد بھی ہو گو آئے
اظہارِ تمنا سے مگر بات ہی کھو آئے　　کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

احسانِ اجل ہے جو ذرا دے مجھے مہلت　　ہے اس کے نظارے کی تمنا دمِ رحلت
وہ دیکھ تو لے آنکھ سے اپنی مری حالت　　ہوں کش مکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے دیکھنے کو آئے

آ کر مرے گھر بھی وہی وحشت ہے وہی رم　　آتے ہی اجازت کے تقاضے ہوئے پیہم
مشکل ہے قیام ایک جگہ کا انھیں اک دم　　ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

تربت میں مری آکے نہ بھاگیں گے نکیرین — مردہ بھی مجھے پاکے نہ بھاگیں گے نکیرین
پرسش سے بھی اکتا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ہیں تیغ بکف کون جو پھرتے ہیں اکڑتے — یہ کون ہیں جو وعظ میں دنیا سے ہیں لڑتے
درپردہ کوئی اور ہے ہم کس سے بگڑتے — جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہوں تو ہر انساں ہمیں دے طعنۂ نایافت — ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
ہم گم ہوئے اور ختم ہوئے طعنۂ نایافت — ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

ہم وہ نہیں ناکامیوں کے نام سے بیٹھیں — اندیشۂ مایوسیٔ انجام سے بیٹھیں
رنج سفر و سختی احرام سے بیٹھیں — اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

اس شوخ کے لانے کی تو کرنے گئے تدبیر — اور واں ترے رونے کی لگے کھینچنے تصویر
ڈوبی ہوئی تقدیر سے الٹی ہوئی تاثیر — کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

---

[1] بادۂ دوشینہ سے مراد رات کی پی ہوئی شراب ہے۔ اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے نکیرین سوال و جواب کیلئے آتے ہیں۔ غالب صاحب شوخی کے انداز میں فرماتے ہیں نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ مرنے سے پہلے مجھے شراب پلا دو۔ فرشتے قبر میں شراب کی بو سے بھاگ جائینگے اور میں سوال و جواب کی زحمت سے بچ جاؤں گا۔ (کیا خوب انداز بیان ہے)

اک لطف وہاں عید کا دن رات ہی غالب　　کیا جلسۂ یارانِ خوش اوقات ہی غالب
مرزا کے لئے وہ درِ حاجات ہی غالب　　اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کی رو آئے

۹۳

جب سے رنگِ بہار طاری ہے　　کچھ عجب کیفیت ہماری ہے
پھر لہو چشم تر سے جاری ہے　　پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پہلے بے کارِ محض تھا ناخن　　اب مگر کام دے گیا ناخن
داغ دل کی طرف بڑھا ناخن　　پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پھر عبادت کا ہے نیا انداز　　اور ہی سمت رُخ ہے وقت نماز
سن کے ناقے کی دل ربا آواز　　قبلۂ مقصدِ نگاہ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

ہو کے گاہک بنے ہیں سودائی　　دیدہ و دل کو کچھ نہ سدھ آئی
رہ گئی ان کی ساری دانائی　　چشمِ دلال جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

مل کے دونوں نے ہے یہ ٹھہرائی　　ایک عالم بنے تماشائی
دونوں ذلت کے ہیں تمنائی　　وہ ہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہ ہی صد گونہ اشکباری ہے

تنگ ہوں ہجر جاں گداز سے پھر　　عشق ہے اس قدر دراز سے پھر
مست ہوں چشمِ نیمباز سے پھر　　دل ہوا ہے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

حسن پھر ترکِ تاز کرتا ہے　　پھر درِ فتنہ باز کرتا ہے
خونِ اہلِ نیاز کرتا ہے　　جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روز بازارِ جاں سپاری ہے

لاکھ صدمے نئے گزرتے ہیں　　جان اس پر نثار کرتے ہیں
پھر دَم اس پُر دغا کا بھرتے ہیں　　پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

آئے ہیں داد خواہ اہلِ نیاز　　ہیں جفا پیشہ گوش بر آواز
ظاہر اب ہوں گے حسن و عشق کے راز　　پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازار فوجداری ہے

ہر زبردست ہو گیا ہے شیر　　زیر دستوں کو کر رہا ہے زیر

عدل و انصاف میں نہ کیوں ہو دیر　　ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر کیا دل نے یوں بیاں احوال　　رو دیئے سُن کے حاکم و عمال
سرِ اجلاس پھر ہے قال و مقال　　پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

ابھی ثابت نہیں جفا کا سبب　　نہ ابھی ہے ثبوتِ قہر و غضب
دیکھئے ہو معاملہ طے کب　　پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہے

عشق انصاف پر اگر آ یا　　بال کی کھال ہی نکالے گا
دیکھئے اس کا ہو نتیجہ کیا　　دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

ہے یہ مرزا کو تو یقیں غالبؔ　　ہوئے مغلوب تم کہیں غالبؔ
مل گیا ہے کوئی حسیں غالبؔ　　بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

(۹۴)

کی سرکشی تو فرطِ ندامت سے خم ہوئے　　اپنی تعلیوں سے خجل دم بدم ہوئے

۹۵

گھر گھر نشاط و عیش کا جوش و خروش ہے | بزمِ طرب کہیں ہے کہیں نائو نوش ہے
اور یہاں و فورِ غم سے پراگندہ ہوش ہے | ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے[1]

ہے چونکہ دردِ ہجر میں دونوں کا ایک حال | ممکن نہیں کہ ایک سے ہو ایک کو ملال
باہم نہیں ہے رشک و حسد کا کوئی خیال | نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال

مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

کم کر دیا ہے نشہ نے ساقی کا اجتناب | سرکا ہے آج رخ سے ذرا گوشہ نقاب
دیدار سے ہے دیدۂ مشتاق کامیاب | مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب

اے شوق ہاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے

اس کے گلے کا ہار جو دُرِّ ثمیں ہوا | گویا صدف کا اخترِ قسمت چمک گیا
اک رشک اور بھی ہے صدف کا تو ذکر کیا | گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا

کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

---

[1] غالب صاحب نے شاگرد کو اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے "ع" "اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے" یہ خبر ہے پہلا مصرع "ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے" یہ مبتدا ہے۔ شب غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ظلمت غلیظ۔ سحر کا پیدا گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں "ایک دلیل صبح پر دیر ہے یعنی بجھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھا دیا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔
پس دیکھا چاہیئے جس گھر میں علامت صبح مؤید ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔"

ہے شکر کی جگہ کہ نہیں ہم وہ مے پرست	دو گھونٹ میں جنھیں نہ رہے ہوش پا و دست
اچھا کیا تمھارے تصور نے بندوبست	دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست

بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

ق

کرتی تھی مجھ کو قلتِ مے یا تو مضمحل	یا اب خیال بادہ کشی بھی ہے جاں گسل
کردار سے ہوں اپنی پشیمان و منفعل	اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

زنہار اگر تمھیں ہوس ناؤ و نوش ہے

سمجھو کچھ آپ اپنے اگر خیر خواہ ہو	سنبھلو ذرا جو طالبِ امن و پناہ ہو
تم بھی کہیں نہ میری طرح سے تباہ ہو	دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

اس بزم میں نہ پاؤ گے کچھ غیر گمرہی	جاتی رہے گی عقل سراسر رہی سہی
مجھ پر گزر رہی ہے جو میں نے تمھیں کہی	ساقی بجلوۂ دشمنِ ایمان و آگہی

مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

کہتے ہیں جس کو اہلِ جہاں محفلِ نشاط	اک خواب خوش سے بڑھ کے نہیں ان میں انبساط
رونق کو اس کی لحظہ بہ لحظہ ہے انحطاط	یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط

دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

چاروں طرف نشاط جمائے ہوئے ہے رنگ	بجتا ہے شورِ قلقلِ مینا سے جل ترنگ

ہے دل میں اہلِ بزم کے اک جوش اور امنگ لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ

یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ہے انبساط و عیش کا منظر تو بزم میں پیدا ہے لطفِ گردشِ ساغر تو بزم میں

کچھ زیست کا مزہ ہے میسر تو بزم میں یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں

نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

حالت ہی اور کچھ نظر آتی ہے بزم کی رونق ہی اس جگہ کبھی گویا ہوئی نہ تھی

محفل جو تھی بھری ہوئی سنسان ہو گئی داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مرزا نے کی نہ کوئی کمی عرضِ حال میں تا ہو نہ مبتلا کوئی مے کے وبال میں

اک درد ہے بھرا ہوا اسکے مقال میں آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

۹۶

گر نہیں ان کو یقیں چاہ کا میری نہ سہی جاں لیکر بھی اگر قدر نہ کچھ کی نہ سہی

وہ تو کہتے تھے ہمیں جان نہیں جی نہ سہی نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

امتحاں اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

میرے حصے میں نہیں گل نہ سہی خار تو ہے دل میں اک صورتِ یادِ گل و گلزار تو ہے

گو مسرت سے ہوں محرومِ غمِ یار تو ہے　　خارِ خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوقِ گل چینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

کیا کوئی فرض ہے ہر روز اسے آئے ہی بنے　　اپنے ہاتھوں سے ہمیں جام پلائے ہی بنے
ہ نہیں ہے نہ ہو مے آج اڑائے ہی بنے　　مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

ے دیوانے کی گو اس نے نہ کی قدر تو کیا　　جوشِ وحشت نے دیا اس کا ستارہ چمکا
ہی آنکھوں کا بیاباں نے بنایا تارا　　نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلی نہ سہی

رکتے ہیں مجھے احباب خفا ہیں ناحق　　ہر گھڑی جب مجھے گھونٹیں تو نہ کیونکر ہو قلق
رِ عشرت ہی نہیں باعثِ رونق مطلق　　ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

ہ عقل پہ حاسد کے پڑا ہے پردا　　کر دیا ہے مرضِ رشک و حسد نے اندھا
لب اپنا اسے سمجھاؤں بھی تو حاصل کیا　　نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ے مرزا جو کہیں اس کو نصیحت سمجھو　　ہیں جو ہمدرد تو یہ ان کی عنایت سمجھو
ا جوانی ہے بہتر یہی حالت سمجھو　　فرصتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

۹۷

کبھی کیا تھا نہ ظالم نے اس طرح کرم آگے ہمارے سامنے سے پہلے تو کرتا تھا وہ ستم آگے
نہ کی تھی تیغ سیرِ قتل گاہ یوں علم آگے عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

مرے ہی حصے میں آئے زمانے کے غم و کلفت مرے ہی واسطے پیدا ہوئے ہیں ماتم و حسرت
خرابیوں سے زمانے کی ہے کہاں مجھے فرصت قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

ہمارے دل کی مٹا دی غمِ فراق نے ہستی بسی بسائی ہوئی حسرتوں کی اجڑی ہے بستی
کچھ اب تو ہمت و طاقت میں قہر کی ہوئی پستی غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عیش کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

بتائیں کیا کہ تمنا ہمارے دل کی ہوا اب کیا لگی ہے دھن کہ نہیں خود جواب کچھ نہ کچھ آسکا
دیا ہے نامہ مگر دل کا ہے کچھ اور ہی سودا خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہونچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

تمہارے چھوڑنے سے رنج میں آ گئے ہیں بلا کے تمہارے پھندے میں آ کے نہ چھٹتے جی کبھی چھوٹے
ہمارا دل ہی کچھ الجھا ہوا تھا کیا کہیں تم سے یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

بہت دنوں تو ہم اس امر کے بہت رہے درپے — ہم اشک خوں یہ بہائیں کہ قصہ ہی کہیں ہو طے
اب اپنی ہستی کا عقدہ کھلا کہ یہ ہے کیا شے — دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

وہ اشک ماتمِ مرزا میں کب بہاتے ہیں غالب — غضب ہے مرنے کی میرے خوشی مناتے ہیں غالب
ملانے خاک میں مجھ کو کہاں وہ آتے ہیں غالب — قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

۹۸

آہ کرنے سے غضب اس کا سوا ہوتا ہے — نالہ کرتا ہوں تو سرگرمِ جفا ہوتا ہے
لب ہلانا سببِ ترکِ وفا ہوتا ہے — شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلہ ہوتا ہے

تنگ ہوں کب تک اٹھایا کروں میں جور و جفا — کونسا ظلم ہے جو آپ نے مجھ پر نہ کیا
بے سبب تو نہیں اشکوں کا مرے تار بندھا — پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

دل غمِ دوست کی ہے عین تمنا یہ تو — ہم جو شاکی ہوں تو وہ اور ستائے ہم کو
کاش آگاہ وہ اسرارِ شکایت سے نہ ہو — گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

کر دیا روز کی گردش نے اسے خستہ حال — پاؤں بھی اب تو اٹھانا ہے اسے سخت محال
ہو گیا خلق کو اندازۂ رفتار محال — عشق کی راہ میں ہے چرخ مکوکب کی وہ چال

سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم یہاں تک تو ہوئے خوگر بیداد و ستم — دیر ہوتی ہے جفاؤں میں تو ہوتا ہے الم
دل کو ہے تازہ جراحات کی خواہش پیہم — کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم

آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

بختِ برگشتہ نے لینے ہی نہ دی ہم کو پناہ — رکھتے اے کاش نہ ہم اپنی بھلائی پہ نگاہ
کام سب سوئے تدبر سے ہوئے اپنے تباہ — خوب تھا پہلے ہی سے ہوتے ہم اپنے بدخواہ

کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

ڈر سے شکوہ نہیں کرتے ہیں کہ ہے ترکِ ادب — ناتوانی کی ہے آخر کوئی حد بھی یارب
زار نالی بھی ہے دشوار دمِ رنج و تعب — نالہ جاتا تھا پرے عرش بریں سے اور اب

لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

طبعِ قدرت نے مجھے دی ہے عجب جادو فن — میں جو چاہوں سرِ قرطاس کھلا دوں گلشن
راگ لا سکتا ہے کیا مجھ سے کوئی مرغِ چمن — خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن

شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

ذات کو تیری کیا حق نے پناہِ عالم — تیرا سایہ سرِ مخلوق پہ ہے ابرِ کرم
اہل دنیا کو ترے فیض سے ہے عیش بہم — اور شہنشاہِ کواکب سپہ و مہر علم

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

محض افسانہ ہیں شاہانِ سلف کے قصے
ہیچ ہیں شوکت و اقبال میں تیرے آگے
کچھ ٹھکانا ہے بھلا جاہ و حشم کا تیرے
سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

گر دیکھتا ہے ترے در کے فلک کا یہ حال
ذرہ ذرہ ترے دروازے کا خورشید مثال
ماہِ کامل کو جبیں سائی میں حاصل ہو کمال
ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

بند ہیں مرغِ چمن مجھ سے خوش الحانی میں
کچھ نہ کچھ نغمہ سرا ہوں جو پریشانی میں
ہے ترا لطف ممد طبع کی جولانی میں
میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

کہئے کیا چرخ ستمگار کو ہی نا انصاف
ذکر کیا غیر کا اپنے بھی ہیں مرزا کے خلاف
کوئی ہمدرد نہیں قاف سے لیکر تا قاف
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

(۹۹)

بلائے دہر ہے بے باکیوں کی خو کیا ہے
تمہارے سامنے انسان کی آبرو کیا ہے
کلامِ ہتک یہ دشمن کے روبرو کیا ہے
ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے[1]
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

[1] حاشیہ صفحہ ۱ پر

نگاہِ گرم سے ظالم نے سب کو دیکھ لیا جلا کر اس کو کیا خاک دم میں سر تا پا
کمال یہ ہے کہ کرتا ہے آگ سے ٹھنڈا نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

برائیوں کے ہماری سبق ہزار وہ دے یقین ہے کہ نہ فقروں میں آؤ گے اس کے
خیال اس کا نہیں ہے کہئے وہ جو چاہے یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے

نہ دے گا کام رفوگر یہاں ترا کچھ فن اٹھائے طاق میں رکھ اپنے رشتہ و سوزن
سرشکِ چشم کے تاروں سے سِل چکا دامن چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

رہا نہ تن ہی تو دل کا کہاں پتا ہوگا یقین ہے جسم سے پہلے ہی مٹ چکا ہوگا
سوائے خاک یہاں دستیاب کیا ہوگا جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

حاشیہ صفحہ ۱۶۹ کا:- غزل مہر نے غالب صاحب سے مانگی انھوں نے غزل بھیجکر مہر کو لکھا "اگر ہم فقیر سچے ہیں یا اور اس غزل کے طالب کا ذوق یکتا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ نیز یہ غزل شیو نرائن آرام کو بھیج کر فرمایا۔
"یہ تمھارا اقبال ہے کہ لو شعر یاد آ گئے ایک غزل یہ اور دو غزلیں وہ جو تم چاہتی ہیں تین ہفتہ کا گودام تمھارے پاس فراہم ہو گیا۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی شیو نرائن ایک ہفتہ وار اخبار میں غالب صاحب کا کلام شائع کرتے تھے۔
کہا جاتا ہے کہ ایک دن ذوق پالکی میں جا رہے تھے کہ غالب کی نظر ان پر پڑ گئی چونکہ دونوں میں ہمعصرانہ چشمک تھی البتہ غالب نے فی البدیہہ یہ مصرعہ پڑھا ذوق نے سن لیا اور بادشاہ ظفر سے شکایت کی۔ غالب جب دربار میں گئے بادشاہ نے پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے۔ غالب صاحب نے یہ پوری غزل سنا دی اور مقطع کا یہ مصرعہ بدل دیا "ہوا ہے الخ

غلط کر رہا ہے جویائے خنجرِ قاتل کہیں گے ہم تو کہ ہے اس کی دوڑ لا حاصل
بہے ہیں شک ہیں گھل گھل کے کیا جگر کیا دل رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جو ہے تو فرقۂ زہاد کو ہے اس کی تمیز کہ کس کو کہتے ہیں غلمان حور ہے کیا چیز
ہمیں غرض نہیں کوئی غلام ہو کہ کنیز وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے

چڑھا کے ساغر و مینائے مے نہ ہوں سرشار سبو بھی منہ سے لگا کر نہ سیر ہوں زنہار
یقین کیجئے میں نام کا نہیں مے خوار پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

ہمارے حال پر ان کو کہیں نظر ہو بھی اور التفات مریضِ فراق پر ہو بھی
نتیجہ خاک نہ ہوگا اگر خبر ہو بھی رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیئے کہ آرزو کیا ہے

عروجِ طالعِ غالب اگر اسے بھاتا حسد کی آگ میں حاسد نہ یوں پھنکا جاتا
نہ پھر یہ شعر وہ مرزا زبان پر لاتا ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

۱۰۰

تابِ الم اب مجھے زنہار نہیں ہے
قابو میں مرے دل افگار نہیں ہے

آہ ذرا دل پر اختیار نہیں ہے
آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے

طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دل کو تو قابو میں اپنے لے لیا پہلے
کرتے ہیں فرمائش جان جاں کے ہم سے

لطف ملے گا بھلا کب عیش سے اسکے
دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے

نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

چھائی ہے کچھ اس طرح کی بیکسی اب تو
روتا ہوں ہمراز ہے کوئی نہ ہے دل جو

شکوہ رقیبوں کا کیا کیا تیرا گلہ ہو
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھکو

ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

وہ بھی تو چاہیئے کچھ رنج کی آخر
کونسی شئے میں ہے پایا عاجز و قاصر

چاہو جو تم جان بھی کر سکتے ہیں حاضر
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر

خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

غفلتِ دل سے بھلا کیا پائے معانی
اسمیں ہی مخفی ہے سب دریائے معانی

اس کو سمجھ منزل و ماوائے معانی
دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی

غیرِ گل آئینہ بہار نہیں ہے

اس پہ کئی میں نے برسوں تک تقاضے
سن کے ہمیشہ مگر کچھ ٹالا ہی اس نے
طالع خفتہ مرے اب کچھ تو ہیں جاگے
قتل کا میرے عہد تو کیا ہے بارے
وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے یہ کیا زہد کی ٹھہرائی ہے غالبؔ
چال یہ مرزا نے تری پائی ہے غالبؔ
جام و سبو کا تو تو سودائی ہے غالبؔ
تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱۰۱

زمانے بھر کے رنج و غم ہیں اور تنہا مرا دل ہے
تحمل مجھ سے اس کوہِ گراں کا سخت مشکل ہے
بڑھا ہے بوجھ اتنا سوئے زانو سر بھی مائل ہے
ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

مجھے اے چارہ گر مدِ نظر راحت نہیں تن کی
مرے لوں تو اگر کاٹے رگیں بھی میری گردن کی
سیئے جا زخمِ دل پروا نہ کر کچھ طعنِ دشمن کی
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

گلستاں میں اگر وہ ذوق افزائی کرے غالبؔ
تو نور اسکا عطا نرگس کو بینائی کرے غالبؔ
عجب کیا بوئے خوش مرزا کو سودائی کرے غالبؔ
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

(۱۰۲)

جس روز کہ تو سیر کو گلزار میں آوے گل تازہ کھلے نکہتِ گل خار میں آوے
بالیدگی سو کھے ہوئے اشجار میں آوے جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

گلگشت میں پیدا ہو عجب لطف کا منظر لے بڑھ کے بلائیں تری ہر شاخِ گلِ تر
گل تیرے قدم لینے کو ہو فرشِ زمیں پر سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

مانا کہ غم و ہم سے دل زار گھلا ہے برسا دیئے مژگاں نے جو دریا بھی تو کیا ہے
آنکھیں بھی لہو رونیں تو کیا فخر ہوا ہے تب نازِ گرانمائگی اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

ہرچند ہوا جوش فرو مجھ کو ستا کر کچھ دل کو ہوئی راحت و تسکین بھی دم بھر
وہ بات بھی کر جس سے ملے لطف مکرر دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اعجاز کا رنگ اپنے بود کھلائے اشارہ بے جان کو جاندار بنا جائے اشارہ
جادو سے غضب دیکھئے کیا ڈھائے اشارہ اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

مصروف دعاؤں میں ہیں کس آس سے یارب　　تا برہنہ پا گزرے کوئی پاس سے یارب
نکلتے ہیں پڑے راہ عجب یاس سے یارب　　کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیِ پرخار میں آوے

آیا مرے آغوش میں کب وہ تنِ نازک　　کس دن ہوا راحت کا سبب وہ تنِ نازک
پھندے میں ہو یوں غیر کے اب وہ تنِ نازک　　مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

پھیلائے ہوئے دستِ طلب جمع ہیں سراسر　　دیکھا ہے زمانے میں انھیں خوار ہی اکثر
انساں کیلئے حرص ہی دشمن ہے قوی تر　　غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

مانا کہ جنوں کا ہے تجھے جوشِ فراواں　　باقی ترے ہاتھوں سے رہی جیب نہ داماں
یوں ٹکڑے اڑانا تو نہیں ہے تجھے شایاں　　تب چاک گریباں کا مزہ ہے دلِ ناداں
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

کیا حالِ تپِ سوزِ دروں کہیئے زباں سے　　لگ جائے کہیں آگ نہ گرمی کے بیاں سے
بہتر ہو کہ پنہاں ہی رہے اہلِ جہاں سے　　آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

ہرزا کی طرح سحر کی قسم اس کو سمجھئے　　مضموں ہے اگر روح تو جسم اسکو سمجھئے
افسوں اسے ٹھہرائے اسم اس کو سمجھئے　　گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

(۱۰۳)

مانند ہے نجم سحر یار کا خال اچھا ہے
اس کے ابرو سے نہ خنجر نہ ہلال اچھا ہے
مہر کچھ ہے تو ذرا قبلِ زوال اچھا ہے
حسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

مفت کے مال کے اس درجہ ہیں خواہاں کہ پناہ
وہ اسی داؤں اسی گھات میں ہیں شام و پگاہ
چاہتے ہیں کہ رقم کوئی ملے خاطر خواہ
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر وقت نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

کب میسر ہوا جمشید کو پیمانہ نیا
دور میں تا دمِ آخر وہی اک جام رہا
دل سے اترا جو پیالہ دور کیا پھینک دیا
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

کر دیا ہے غمِ ہجراں نے مرا سینہ شق
نام ہی نام ہے اب جان کا باقی ہے رمق
رنگ رہتا ہے مرا یوں تو غم و درد سے فق
انکے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

انکے ہاتھوں سے کسی کو بھی نہیں پہنچا فیض
دین و ایماں کے یہ دشمن ہیں تو پھر کیسا فیض
بندگی کر کے بھی دیکھا تو نہ پایا یا فیض
دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

فن ہے وہ چیز کہ فرہاد کی دی بات بنا — ورنہ شیریں سے کرے بات یہ اسکا منہ تھا
جس ہنر میں تھی اسے مشق وہ کام آ ہی گیا — ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

وصل محبوب سے اے کاش ہمارا ہو جائے — دور جلدی کہیں یہ پردہ دوی کا ہو جائے
جزو ہو واصلِ کل ایک ہی نقشا ہو جائے — قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

کس کے دروازے سے جو چاہے گدا ملتا ہے — اور جو ملتا ہے تو با چون و چرا ملتا ہے
دربدر بھیک اگر مانگئے کیا ملتا ہے — بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

تا ابد اس کو خدا رکھے سراسر سرسبز — اس چمن میں رہے یہ رشکِ صنوبر سرسبز
ہو سدا اس کا چمن زارِ مقدر سرسبز — خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

کٹ رہے ہیں اسی امید میں مرزا کے بھی دن — صرف اسی آسرے پر ہے دل مضطر ساکن
یہ تصور جو نہ ہو کب ہے تسلی ممکن! — ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہم ہیں مشتاق، کی ساقیِ گلفام کے   اہلِ محفل ہوں مُحق انعام کے
حوصلے پورے ہوں خاص و عام کے   غیر ہیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

ظلم سے خالی ہے کوئی کِہ نہ مِہ   درپئے ایذا ہیں اہل شہر و دِہ
تم سے کیوں پڑتی مرے دل میں گِرہ   خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

دل میں اس ناوک فگن کے ہے گِرہ   یہ کمان اپنی کئے رہتا ہے زہ
تاک میں سب کی ہے کہ ہو یا کہ مہ   خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام ہے

تم جوابِ خط ہمیں دو یا نہ دو   ہم کو حاصل ہے غرض ہے دل کی جو
اس بہانے نام لکھا جائے تو   خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

جوشِ مستی میں کیا طوفِ حرم   خشتِ خم پر کی ادا رسمِ ستم
زہد میں رندی سے بھی چوکے نہ ہم   رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

تھی بلا اپنے لئے اپنی نظر ہتکنڈوں کی اس کے تھی کس کو خبر
اپنے ہاتھوں خود ہمیں پہنچا ضرر دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

ہو چکا ظاہر دعاؤں کا اثر سب تھے مصروفِ دعا شام و سحر
شاد پھرتے ہیں طبیب اور چارہ گر شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

پوچھ لو مرزا سے اپنا مشغلا شغل ہو سکتا ہے کیا بے کار کا
روگ ہی کچھ دل کو بیٹھے بٹھائے لگ گیا عشق نے[1] غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

---

[1] مرزا تفتہ کو لکھا ہے "بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی تمام دن پڑا رہتا ہوں بیٹھ نہیں سکتا ع ضعف نے غالب نکما کر دیا۔"

اسی طرح دہلی سوسائٹی کے جلسے میں اپنا ایک مضمون پڑھا۔ فرماتے ہیں "بوڑھا ہوں، ناتواں ہوں سچ اگر پوچھئے تو نیم جاں ہوں" "ضعف نے غالب نکما کر دیا" ریاض الدین امجد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں نے یہ شعر ان کے سامنے پڑھا "عشق نے غالب نکما کر دیا" تو فرمایا "بھائی چپ رہو۔ یوں کہو ضعف نے غالب نکما کر دیا۔ یا دہر نے غالب نکما کر دیا۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔"

مولوی احمد حسن قنوجی کو لکھا "یہ درویش گوشہ نشین تمہارا دوست اور تمہارا دعا گو ہے از عشق نے غالب...... پینسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلالِ قویٰ، ضعفِ دماغ، فکرِ مرگ، غمِ عقبیٰ جو مجھے آپ دیکھ گئے ہیں میں اب وہ نہیں ہوں۔"

۱۰۵

ہر شجر نے نئی قبا پائی　　بوئے گل کو صبا اڑا لائی
گلِ نرگس نے پائی رعنائی　　پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

ہے صفائی سمک سے تا بہ سماک　　نظر آتے نہیں خس و خاشاک
ہر چمن ہے غبار و گرد سے پاک　　دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اوس کی ہے بہار سبزے پر　　گل چمکتے ہیں صورتِ اختر
کہئے بے ساختہ نہ پھر کیوں کر　　کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
رشکِ سطحِ چرخِ مینائی

ابرِ باراں نے آبیاری کی　　قوتِ نامیہ کو حرکت دی
نظر آتی ہے شاخ شاخ ہری　　سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
ہو گیا روئے آب پر کائی

سبز مخمل بچھائی سبزے نے　　کھل کھلاتے ہیں ہر طرف غنچے
پھول کیسی شاخ شاخ پر پھولے　　سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے
چشمِ نرگس ہوئی تماشائی

بزمِ عالم ہے مے کدے کی نظیر جھوم کر چھا گیا ہے ابرِ مطیر
مست پھرتے ہیں سب صغیر و کبیر ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

شاد مرزا ہے ہر گھڑی غالب کہ دعا کارگر ہوئی غالب
عام ہے عیش و خرمی غالب کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

۱۰۶

نہ چلی سحر بیانی میری ہیچ نکلی ہمہ دانی میری
بھول کر بات نہ مانی میری کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

دردِ دل اے ستم انگیز نہ پوچھ حالِ چشمِ غضب آمیز نہ پوچھ
زخم نوکِ مژۂ تیز نہ پوچھ خلش غمزۂ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری

مجھ کو اپنا ہی نہیں ہائے خیال دوستوں تک تو کہاں جائے خیال
کس طرح ان کا مجھے آئے خیال ہوں زِ خود رفتہ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

ہے حریف اپنا بھی کتنا بودا　　مجھ کو جس بزم میں پایا نہ جدا
میری ہر بات میں ضد ہے گویا　　متقابل[1] ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

جبکہ نظروں میں سبک ٹھہرا ہوں　　کیوں ترے دل پہ گراں اتنا ہوں
کیا حقیقت ہے مری میں کیا ہوں　　قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

کیوں نہ بے ساختہ چکر کھاؤں　　گردشِ دہر سے ہے حال زبوں
غیر ممکن ہے کہ ٹھہروں دم لوں　　گردبادِ رہِ بے تابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

موشگافی کا مجھے دعویٰ تھا　　عقدۂ موئے کمر ہی نہ کھلا
تھا غلط زعم ہمہ دانی کا　　دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچ مدانی میری

خط جو لکھتا ہوں تو خاصہ طومار　　بات کرتا ہوں تو دیوانہ وار
کیا مجھے یاد کریں گے غم خوار　　کیا بیاں کر کے مرا روویں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

---

[1] عبدالرزاق شاکر کے ایک خط میں تشریح کی ہے "تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج، وجود و عدم۔ لفظ مقابل اس مصرع میں بمعنی مرجع ہے جیسے حریف کہ بمعنی دوست بھی مستعمل ہے مفہوم شعر: ہم اور دوست از روئے خوئے و عادت ضد ہمدگر ہیں وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا۔"

مثل مرزا ہوئی طاقت غائب قلب قابو میں نہ بس ہیں قالب
خاک ہوں زیست کا اپنی طالب کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگ پیری ہے جوانی میری

۱۰۷

رگ رگ ہے مری نشترِ فساد کی بھوکی ہو جلد رواں تیغ پہ حسرت ہے گلو کی
راحت ہے جراحت کو روانی سی لہو کی جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی
وہ دن گئے تھیں خون سی جب اپنی رگیں پُر اور آنکھ سے تھا خون کے اشکوں کا تقاطر
خونِ جگر و دل تو ہوا رزقِ تفکر اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
ناحق ہے قیامت کا تمھیں خوف ابھی سے کچھ ظلم بھی کرتے ہو تو سہمے ہوئے جی سے
کرنے دو اگر کرتے ہیں شکوہ یہ کسی سے کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
جب رُخ نہ کیا ہو ترے تیروں نے ادھر کو کاٹا نہ ہو شمشیر نے سودا بھرے سر کو
کیا لطف ملے زیست کا پھر ایسے بشر کو دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

مرزا غمِ دنیا سے رہا موت کا طالب چاہا کہ کرے ترک کہیں جان یہ قالب
حاصل ہوا مطلوب نہ برائے مطالب صد حیف وہ نا کام کہ اک عمر سے غالبؔ
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

۱۰۸

حسن ہی کا دل کو سودا چاہیئے اشتیاقِ روئے زیبا چاہیئے
رات دن شوقِ تمنا چاہیئے چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

نشہ ہوتا ہے کب ان کو اس قدر کچھ نہ ساقی کے سوا آئے نظر
لاکھ یہ پیتے رہیں آٹھوں پہر صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے

پا کے ثمرہ پیار کا دل ہے خجل ہو گیا ہے درد و غم سے مضمحل
اب تو یہ ہے اور دردِ جاں گسل چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

مجرموں سے پردہ ہے دیوانگی یہ تمنا فراور یہ ہم خانگی
ہم سے چھپنا ہے کوئی فرزانگی دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

موت کا پاتا ہوں جو یا غیر کو   رشک نے میرے ڈبویا غیر کو
رات دن کا غم ہے گویا غیر کو   دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر   دشمن ہے دیکھا چاہیئے

پند میں ناصح نے بھی کرلی ہے سعی   قید سے یاروں نے کیا کم کی ہے سعی
بارہا ہم نے بھی کر دیکھی ہے سعی   اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

کب ہے مایوسوں کو امیدِ نوید   گوش زد ہوا ن کے کیونکر یہ نشید
کچھ نہ پوچھو حسرتوں کا اپنی بھید   منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید[1]
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

پیرزن نادم نہ تھی اپنے قصد سے   منہ نہ تھا کیا اس کا کر وہ یوسف کو لے

---

[1] غالب صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو ۱۰ر جنوری ۱۸۵۰ء کے خط میں لکھا "کیا کروں؟ مفت غمزدہ اور ملول رہتا ہوں۔ مجھ کو اس شہر کی اقامت ناگوار ہے اور موانع دعوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا خلاصہ میرے رنج والم کا یہ ہے کہ میں صرف مرنے کی توقع پر جیتا ہوں ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

یہ شعر مرزا یوسف کو بھی ایک خط میں لکھا ہے علاوہ ازیں چودھری عبدالغفور کے خط میں حسب مضا عالم مارہروی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے "حضرت سچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے سانس نہیں لے سکتا اس تنگ کر دیا ہے ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچتا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشیں ہے نتیجہ اس کا تسکین ہے، ہیہات۔ ؎ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ؛ نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے"

آ رہی تھی یہ صدائے غیب اسے — غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے

چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

یہ ضعیفی اور تلاشِ خال و خد — جستجوئے نازنینِ سرو قد

اس جنوں کی بھی ہے مرزا کوئی حد — چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

۱۰۹

کس طرح طے ہو رہِ عالمِ امکاں مجھ سے — میں تھکا ماندہ ہوں اور دور ہے جاناں مجھ سے

ذرہ ذرہ دمِ وحشت ہے گریزاں مجھ سے — ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے

میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

جبکہ دیباچے سے کھلتے ہیں مضامیں یکسر — پھر یہ فرصت ہے کسے بیٹھ کے دیکھے دفتر

اور ہی دام میں الجھی ہوئی ہے اپنی نظر — ورنہ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر

ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

کیا کہوں کیسے بسر ہوتی ہیں غم کی راتیں — میرے احباب بیاں کی مجھے تکلیف نہ دیں

بیکسی کا مری اندازہ اسی سے کرلیں — وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں

دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے

میرے ماتم میں وہ جب آ کے پھرے ہے گریاں — پھر خود آرائی و زینت کا وہ ساماں کہاں

مٹ گئی سرمہ کی تحریر کہ ہیں اشک رواں   غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں

کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

چونکہ ہے دشت مرے پاؤں سے آغشتہ بخوں   ذرے ذرے کو یہ دعویٰ ہے کہ میں اخگر ہوں

کیوں چمکتے ہوئے چھالوں کو جواہر نہ کہوں   اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں

صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

کاش ہر اک شبِ غم میں یہی بے ہوشی ہو   تا کچھ آرام سے یہ ہوش ربا گزرے تو

اس نے تو خوب ہی پہنچائی ہے راحت دلکو   بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو

پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

منحصر قتل پہ ہیں آنکھ کے ارماں سارے   کٹکے سر پہ نظر ہو تو کروں نظارے

تیغ گل گیر سے کم مجھ کو نہیں ہے پیارے   شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے

ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

کیا شبِ تار نے ڈھائی ہے قیامت ہے ہے   چھوڑ دی سایہ نے بھی میری رفاقت ہے ہے

کتنی پُر خوف ہے منزل گہہ فرقت ہے ہے   بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے

سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بادۂ حسن سے غیروں کو تو یوں مست کرے   تشنہ لب وہ رہیں دیدار کے جو طالب تھے

خوب انصاف کیا ساقیِ مہوش تونے   گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے

ے مخفف ہوجیو کا ۱۲

آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

آگ وہ سینۂ مرزا میں بھڑکتی ہے اسدؔ
دیکھ کر برق جسے دور سرکتی ہے اسدؔ
دل میں بھی آتشِ جاں سوز دہکتی ہے اسدؔ
نگہہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ

ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

۱۱۰

دل میں وہ درد کہ جو اسکو دکھائے نہ بنے
حال اپنا وہ زبوں جسکو چھپائے نہ بنے
بارِ غم میں وہ گرانی کہ اٹھائے نہ بنے
نکتہ چیں ہے غمِ دل اسکو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

گو بظاہر نہیں کچھ اس کا بلانا مشکل
ڈر مگر یہ ہے کہ ہٹ میں ہے وہ اپنی کامل
کہیں ہونا نہ پڑے اسکے نہ آنے سے خجل
میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اے جذبۂ دل

اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لذتِ جور و جفا کو کہیں وہ شوخ نہ پائے
قدر نہ چڑھ جائے کہیں ایسی کہ پھر دل نہ دکھائے
ہاتھ دانستہ کہیں ظلم سے ظالم نہ اٹھائے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے

کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

خود تو رسوائے جہاں ہے ہی یہ بد ذات مگر
نیک نامی کو کہیں تیری نہ پہنچائے ضرر
راز داری کسے کہتے ہیں اسے کیا ہی خبر
غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

شاخ ہی تنگ ہے گلِ تر کا شگفتہ رہنا — ہاتھ گل چیں کا پڑا اور وہ پژمردہ ہوا
چشمِ بد دور وہ نازک ہیں کہیں گل سے سوا — اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

نور یہ مہر میں یہ مہ میں ضیا کیسی ہے — کس کی بو ہر گلِ نوخاستہ میں مخفی ہے
ہر طرف طرفہ تماشائے نظر بندی ہے — کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

غم سے گھل کر جگر و دل مرے اشکوں میں بہے — میں نے اب تک تو ستم وعدہ خلافی کے سہے
منتظر کیوں ہوں تمھارا کوئی اب لاکھ کہے — موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے[1]

تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

---

[1] اس شعر کی تشریح غالب صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس طرح لکھی ہے "بھائی مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا اس میں دو استفہام آ پڑے ہیں کہ وہ بطریق طعن و تعریض معشوق سے کہے گئے ہیں موت کی راہ نہ دیکھوں۔ کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ بن آئے نہ رہے کیونکہ موت کی شان میں سے یہ بات ہے ایک دن آئے ہی گی انتظار ضائع نہ جائے گا۔

تم کو چاہوں؟ کیا خوب، کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے۔ یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تم کو بلا سکے گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ بن بلائے بغیر آئے نہیں رہتی تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ سکوں۔"

یہ غزل غالب صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس غزل کے ساتھ جس کا مطلع ہے ؎

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مُو آئے — اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

ارسال کی تھی۔

ہیں بُرے پیچ میں تقدیر سے ہم آئے ہوئے بات بنتی نظر آتی نہیں تدبیروں سے
کر دیا ہے ہمیں مجبور بہت قسمت نے بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق کی خاک کرے کوئی ستائش غالبؔ الاماں قہر ہے اس برق کی تابش غالبؔ
بار ہا کی ہے یہ مرزا نے گزارش غالبؔ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

آیا مرزا کو جسے دیکھتے ہی غش غالبؔ تم نے دیکھا نہیں وہ شعلۂ سرکش غالبؔ
بابِ الفت میں عبث تم ہو مشوّش غالبؔ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۱۱۱

شبِ فراق ہیں لحت وہ بے حساب تو دے لگی ہے آگ جو سینہ میں اسکو آب تو دے
نجاتِ غم سے وہ پردہ نشیں شتاب تو دے وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

جوابِ غیظ و غضب سے ہر ایک کو دینا ہے ایک ان ہی دونوں جہاں سے کھو دینا
وہ بھر کے سانس جگر میں چھری چبھو دینا کرشمے ہے قتل لگاوٹ ہی تیر ارو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

لہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰ پر

لگا کے منہ سے عطا کوئی جام کر ہم کو   امیدوار نہ یوں صبح و شام کر ہم کو
جوابِ تلخ ہی سے شادکام کر ہم کو   دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

خیال چھوت سے بچنے کا ہے نہ عادت ہے   نہ اجتناب کسی سے نہ کچھ عداوت ہے
ہمیں سے اک تجھے پرہیز اور کراہت ہے   پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

شب اسکی بزم سے اغیار یوں ملول گئے   کہ پاؤں اٹھ گئے اور چوکڑی وہ بھول گئے
قبول خدمتِ مرزا ہوئی وہ غول گئے   اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے[1]
کہا جو اس نے مرے ہاتھ پاؤں داب تو دے

حاشیہ صفحہ ۲ کا ۱۔ اس غزل کے بارے میں مرزا علاؤالدین کو بڑے قلق کے ساتھ لکھا "پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ سے پلا دے اوک سے الخ سے اسد خوشی... الخ۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھکر اس مطلع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کرکے غزل بنالی ہے اور اسکو لوگ گاتے پھرتے ہیں مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اتو کے..... جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کردیں تو کیا بعید ہے کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔"

[1] مقطع کے متعلق ایک لطیفہ بھی ہو سکتا ہے غالبؔ صاحب ایک مرتبہ پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ مہر (مہدی) پاؤں دابنے لگے غالب صاحب نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے۔ انھوں نے نہ مانا اور کہا "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دیدیجئے۔" غالب صاحب نے کہا "ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔" جب وہ پیر داب چکے تو اجرت طلب کی۔ غالب نے کہا "بھیا کیسی اجرت تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہارے پیسے دابے۔"

۱۱۲

اُدھر ناگفتہ بہ حالِ زبوں و خوارِ بستر ہے
ادھر مرمو نئے تن خود مرے حق میں خارِ بستر ہے

دلِ بیتاب و مضطر باعثِ آزارِ بستر ہے
تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے

مرا سر رنجِ بالش ہے مرا تن بارِ بستر ہے

حقیقت اشک کی اور دل کی تم سے کیا کہیں ہے ہے
مگر ہاں مختصر سن لو کہ وہ کیا شے ہے یہ کیا شے

ہمارے ناز پرور دوں میں ہیں دونوں مبارک پے
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نورالعینِ دامن ہے

دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

زہے قسمت کہ تم یوں بے بلائے میرے گھر آؤ
مرے بیت الحزن کے جاگ اٹھے ہیں نصیب اب تو

مرض کا اپنے بڑھ جانا مبارک ہو گیا مجھ کو
خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے تو

فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

ہوا اندھیر گھر میں کیا بلا فرقت کی رات آئی
در و دیوار پہ ہے کس غضب کی تیرگی چھائی

مگر ہاں گھر نے بستر کی بدولت روشنی پائی
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

خدا کا شکر ہے تقدیر ہے جاگی ہوئی اپنی
پھر اسکے خواب میں آنے کی حسرت کیوں ہمیں ہوتی

بتائیں کیا ابھی کل ہی تو وصلِ یار کی شب تھی
ابھی آتی ہے بو بالش سے اسکی زلفِ مشکیں کی

ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

ہوا ہے مبتلا مرزا عجب آزار میں غالب
رہا کچھ بھی نہ باقی اسکی جانِ زار میں غالب
نہیں اٹھنے کی بھی طاقت اس بیمار میں غالب
کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بے تابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

۱۱۳

بنی ہے بات اپنی تو کہیں اَن بَن نہ ہو جائے
محبت کی جگہ نفرت تجھے پُر فن نہ ہو جائے
رہا غرہ تو میر نفس ہی رہزن نہ ہو جائے
خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے
کمالِ فصلِ گل کہتے ہیں اسکو میرزا غالب
کہ ہو ہر ہر شجر پہنے ہوئے گل کی قبا غالب
سرِ گلبن کھلیں دو چار گل تو کیا مزا غالب
سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

۱۱۴

کیا جانے اصول ہے نہیں ہے
آہنگ بھی کوئی طے نہیں ہے
با قاعدہ کوئی شئے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ لے نہیں ہے
گلشن کو غرض نہیں جو مے سے
کیا معنی ہیں پھر کدورتے کے

کشکول کا کام کیا نہ لیں گے　　کیوں بوتے ہیں باغباں تو بنے
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

جلوہ تیرا ہی چار سو ہے　　ہر ایک کو تیری جستجو ہے
تجھ سے ہی گلوں میں رنگ و بو ہے　　ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

بے جا ہے خودی و خود پرستی　　ایک وہم و خیال ہے یہ بستی
لا شے ہے یہ اوج اور پستی　　ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

پیوستہ ہر ایک شے ہے ضد سے　　ہوتی ہے نشاط بعد غم کے
خواہاں ہے اگر الم سے چھوٹے　　شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

کچھ وہم مگر تجھے ہے زاہد　　انکار شراب سے ہے زاہد
ملتی یہ شے کسے ہے زاہد　　کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

مرزا ترا ہم قدم ہے غالب　　دھیان اس کو یہ دمبدم ہے غالب
دم کہتے ہیں جس کو دم ہے غالب　　ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

۱۱۵

کچھ رشکِ رقیبوں ہی سے تنہا نہیں کرتے — اپنی بھی نظر سے انھیں دیکھا نہیں کرتے
جان آئے جو لب پر بھی تو پروا نہیں کرتے — ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں و لے ان کی تمنا نہیں کرتے

وہ غیر جو کہتے ہیں یہ کہنا ہے زبانی — لیکن ہے رقیبوں سے لگاوٹ کی نشانی
ہم سے کوئی آسان ہو یوں بات بنانی — در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پروا نہیں کرتے

قابو نہ کسی شخص کا تم پر ہے نہ بس ہے — مانو تو یہ مرزا کی نصیحت تمھیں بس ہے
باز آؤ اگر مہر و وفا سے تمھیں مس ہے — یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

۱۱۶

مرے سبب سے یہ خستہ جگر ہے کیا کہیے — غریب کشتۂ تیغِ نظر ہے کیا کہیے
فریبِ حسن سے یہ بے خبر ہے کیا کہیے — دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

---

[۱] غالب صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو لکھا کہ بھائی یہاں بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا ہے ہر مہینے میں دو بار مشاعرہ ہوتا ہے پندرھویں کو اور انتیسویں کو۔ حضور فارسی کا ایک مصرع اور ریختے کا ایک مصرع (باقی صفحہ ۲۰۶ پر)

بدن سے جان کسی طرح جائے بن نہ رہے — فراق جسم کا صدمہ اٹھائے بن نہ رہے
مگر ہمیں تو یہ پھر بھی ستائے بن نہ رہے — یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے

قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

ضرور ہے کوئی موجودگی کا اسکی سبب — اسی کو گشت میں پایا وہاں گئے ہم جب
کچھ اور شغل ہی اس کو نہیں ہے روز و شب — رہے ہے یوں گہہ و بیگہہ کہ کوئے دوست کو اب

اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

ہمارے سر پہ تھا جنگ شباب کا آسیب — نہ راہ عشق کا سوجھا کبھی فراز و نشیب
اس اک گمان سے حاصل ہوئی دل کو صبر و شکیب — زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب

کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

ہمارے درد و الم کا ہوا کب ان کو خیال — بلا کے گھر کبھی پوچھی نہ وجہ رنج و ملال
وہ بے سمجھ نہیں یہ سمجھا ہے ایک ان کی چال — سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال

کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہیے

تمھارے انس و محبت کا ہے عجب احوال — کہ بات بات میں ہو دوستوں سے رنج و ملال
تمھیں سے ہم بھی اگر ہوں تو ہے نباہ محال — تمھیں نہیں ہے سر رشتۂ وفا کا خیال

بقیہ صفحہ ۲۰۶ کا: طرح کرتے ہیں۔ اب کے جمادی الثانی کی تیسویں کو جو مشاعرہ ہوا، اس میں مصرع فارسی یہ تھا: زہے تماشا گاہ گر ماں می رود۔ ریختہ: مصرع یہ تھا: خمارِ عشق ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے۔ نظر ہے کیا کہیے، خبر ہے کیا کہیے۔ میں نے ایک غزل فارسی اور ایک ریختہ موافق طرح کے اور دوسرا ریختہ اسی طرح میں سے ایک اور صورت نکال کر لکھا۔ وہ تینوں غزلیں تم کو لکھتا ہوں، پڑھ لینا اور میاں تفتہ کو بھی دکھا لینا۔"

ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیئے

کبھی کیا بھی جو کچھ عرضِ حالِ دل ہم نے
تو مسکرا کے کہا کیوں ہوئے ہو دیوانے

فضول ہو جیئے ہر وقت دو بدو ان سے
انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے

ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیئے

کسی کو ہم سے اگر رشکِ فن ہے کیا کیجئے
حسد کی آگ اگر شعلہ زن ہے کیا کیجئے

جہان کی یہی رسمِ کہن ہے کیا کیجئے
حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجئے

ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیئے

کٹے جہان میں مرزا بہ مشکل اس کے دن
ہزار عیب لگاتے ہیں اس کو بد باطن

بُرا بُرا اسے کہتے ہیں سب جوان و مُسن
کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن

سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے

۱۱۷

جب تلک آزاد تھا کب تھی پریشانی مجھے
تھی عدم میں ہر طرح حاصل تن آسانی مجھے

کھینچ کر زنداں میں لائی میری جولانی مجھے
دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے

کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

یوں مرا سینہ دبائے وہ مری قسمت کہاں
اور گلے پر اسکے ہاتھوں سے ہو یوں خنجر رواں

اور کیا اسکے سوا ہے خوش نصیبی کا نشاں
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں

مرحبا میں۔ کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

رات دن آتا ہے جب اسکا تصور بے بہ پے — مجھ کو عرضِ حال میں مانع نہیں پھر کوئی شے
ہوں اسی دھن میں یہی مجھ کو لگی رہتی ہے لے — کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

میری بربادی تو قدرت نے مقدر کی ہی تھی — اس پہ طرہ یہ ہوا گھر کی بلا سر پڑ گئی
یہ ہوئی اچھی عنایت کاتبِ تقدیر کی — میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے

ملتی جلتی ہے فغاں اسکی مری فریاد سے — شوق سے سنتا ہوں اپنا ہم نوا پاکر اسے
ڈال رکھا ہے پریشانی میں اسکے وہم نے — بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

چرخ کے ہاتھوں نہ پایا چین میں جب تنگ تھا — داؤں جب اس کا چلا کچھ ظلم ہی مجھ پر کیا
تنگ آ کر زیست سے جامِ اجل آخر پیا — وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

یہ رقیبِ روسیہ یوں ہی اگر دمساز ہے — جھوٹ پر رغبت دلائیگا کہ خود غماز ہے
منتظر رکھنا کسی کو یہ بھی کوئی ناز ہے — وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

چاہیئے بھائی سے یوں بھائی کو مرزا دوستی — ہو جو اس کو خرمی تو خرمی ہو اس کو بھی

جس طرح غالبؔ کی اس شعر میں ظاہر خوشی دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

(۱۱۸)

خود فراموشی ہوئی وقتِ مسرت کب مجھے دل ہی جب نالاں ہو پھر فرحت سے کیا مطلب مجھے
لب پر اس کا نام تھا کچھ درد پہنچا جب مجھے یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

کہہ گیا دل رفع دل سے ہو گیا رنج و محن کر رہا ہے پرسشِ احوال ہر غنچہ دہن
بات بن جاتی ہو ہوتا ہے جو کوئی حرف زن ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

اک طرف چپکا پڑا تھا کیا زندان میں تھے کیوں نہ آئیں یاد رہ رہ کر وہ دن آرام کے
مہلت اب دم بھر نہیں آوارگیِ دشت سے یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے
رشک آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

رات دن بہتی ہیں آنکھوں سے رواں اک جوئے خوں حال دل بھی ہو گیا ہے کثرتِ غم سے زبوں
عمر گزری ہے کہ میں اس ذوق کا خوگر ہوں طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

مجھ سے فرماتے تھے طنزاً کیوں تم ایسے ہو گئے کیا ہوا مرزا تمھیں دیوانے کس کے ہو گئے

اب تو حضرت کیلئے موزوں یہ فقرے ہوگئے　　　دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہوگئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

(۱۱۹)

کمالِ علم اہلِ انجمن کی آزمایش ہے　　　ہنر کا امتحاں ہے اہلِ فن کی آزمایش ہے
ہراک نو مشق و مشتاقِ کہن کی آزمایش ہے　　　حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمایش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمایش ہے

محن میں ہر گرفتارِ محن کی آزمایش ہے　　　گداز و سوز میں شمع لگن کی آزمایش ہے
قفس کی قید میں مرغِ چمن کی آزمایش ہے　　　قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمایش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے

کہیں ایسا نہ ہو محنت ہو اسکی رائیگاں آخر　　　نہ جوئے خوں ہو جوئے شیر کے بدلے رواں آخر
غمِ شیریں سہے گا کس طرح وہ نیم جاں آخر　　　کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروے تن کی آزمایش ہے

سنی ہے اس نے کب یعقوب کی آہِ سحرگاہی　　　سنگھا کر بوئے یوسف اسنے کب اسکی خوشی چاہی
ہوئی ہے ادھر ہی مطلب سے کنعاں کی ظفر راہی　　　نسیم مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمایش ہے

یہ کیا کرتے ہو تم ضبط و تحمل کے غلط دعوے　　　یقیں جانو کہ ہوش اڑ جائینگے جب اسکو دیکھوگے

جسے دعویٰ ہو اہلِ بزم میں اب وہ سنبھل بیٹھے
وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمایش ہے

نشانے دو ہیں جسکو بھی اڑادے اسکا تیر آکر
تو پھر شک قادر اندازی میں اسکی کیجیے کیونکر
کماں کو کھینچنا ہی اسکا اک احسان ہے ہم پر
رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرضِ شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمایش ہے

بظاہر تو یہ دونوں ایک ہی بت کے ہیں سودائی
مگر رسم پرستش مختلف دونوں نے ٹھہرائی
عبث گردن ہر اک نے رشتہٗ الفت میں بندھوائی
نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

نتیجہ ناشکیبائی کا آخر کیا ہے اے غافل
تڑپنے سے کہیں آسان ہو سکتی ہے یہ مشکل
نہ ہو جائے کہیں تجھ پر کوئی تازہ بلا نازل
پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پر شکن کی آزمایش ہے

ہمارا قصد تھا چکھیں کسی دن ہم بھی اس سم کو
مزہ لینے نہ پائے خود بخود گھلنے لگے ہم تو
زباں کا ذکر کیا اسکا اثر آ گئے تو بڑھنے دو
رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے

سنا تو ہے انھوں نے یہ ارادہ کر لیا غالب
کہ وہ مرزا سے باندھیں عہد و پیمان فاغالب
مگر اب دیکھئے یہ چرخ لائے رنگ کیا غالب
وہ آئینگے مرے گھر؟ وعدہ کیسا؟ دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمایش ہے

۱۲۰

اگر وہ روٹھتا ہے کب منایا جائے ہے مجھ سے
مرے دل بھی جاتا ہے تو کھنیا جائے ہے مجھ سے
غرض جتنا بناتا ہوں بگڑتا جائے ہے مجھ سے
کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

نظر آتا ہے خوابِ وصل تو تعبیر الٹی ہے
بگڑ جاتا ہے بنکر کام کیا تقدیر الٹی ہے
مرے سب کام الٹے ہیں مری تدبیر الٹی ہے
خدایا جذبہ دل کی مرے تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

اسے کیونکر سناؤں حالِ دل ہے سخت حیرانی
پریشانی کا مضمون اور بیاں میں ہے پریشانی
کھلائے دیکھئے کیا گل مرے قاصد کی نادانی
وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

یہ میری سرگزشت ان کیلئے جھوٹی کہانی ہے
انھیں سننے سے نفرت ہے یہاں طی لسانی ہے
مجھے دشوار اپنے دل کی کیفیت سنانی ہے
ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے ان سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

ہماری زیست امید و تصور کی بدولت ہے
قضا کا سامنا ہے کیا بلا ضعف و نقاہت ہے
خیالی زندگی ہے ورنہ کیا جینے کی صورت ہے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

گوارا دلکو یہ کب ہے کہ دیکھیں اسکو انس و جن　　تقاضا رشک کا یہ ہے وہ آنکھوں میں رہے ساکن
وہ جب جلوہ نما ہوگا تو ہوگا حشر کا وہ دن　　تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

سمجھ رکھا تھا میں نے عشق کو اک دل لگی دل کی　　کہاں کی دل لگی یہ تو مصیبت پڑ گئی الٹی
خبر کیا مجھ کو اس کی معرکہ آرائیوں کی تھی　　ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

مجھے آتا ہے یہ خواب پریشاں کیا نظر غالب　　بنے گی دیکھئے کیسی دلِ بیتاب پہ غالب
نہ کیوں اس رشک سے ہو خون مرزا کا جگر غالب　　قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(۱۲۱)

گردش میں جو ہے گنبدِ خضرا مرے آگے　　فانوسِ خیالی کا ہے نقشا مرے آگے
ہے ارض کو اک گیند کا رتبا مرے آگے　　بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک بلبلہ ہے گنبدِ گرداں مرے نزدیک　　ذرے سے بھی کمتر ہے بیاباں مرے نزدیک
ہے شعبدہ نیرنگیِ دوراں مرے نزدیک　　اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

؎ حاشیہ ص۲۱۴ پر

اعراض ہیں اوہام تو اجسام ہیں مستور ۔ ہر نام ہی نام انکا حقیقت ہی ہیں سب دور
ہر رنگ میں موجود ہے صرف ایک وہی نور ۔ جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور

جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

اڑتا ہے بیابان کا خاکا مرے ہوتے ۔ اٹھتا ہے بگولے پہ بگولا مرے ہوتے
اشکوں سے ہی سیلاب کا نقشا مرے ہوتے ۔ ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے

گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

دیکھے تو کوئی دل کا تڑپنا ترے پیچھے ۔ کیا کہئیے گزر جاتی ہے کیا کیا ترے پیچھے
جینا ہے مجھے دشوار ہے گویا ترے پیچھے ۔ مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

حاشیہ صہ ۲۱۳ کا:۔ اورنگ سلیماں حضرتِ سلیمان ع کا تخت۔ حضرت سلیمان ع ایک پیغمبر گذرے ہیں۔ انکی بادشاہت بنی نوع انساں پر ہی نہ تھی بلکہ چرند پرند اور جنوں پر بھی انکی حکومت تھی اور جنوں کی مدد سے انکا تخت ہوا میں اڑتا تھا۔
اعجازِ مسیحا۔ عیسیٰ ع کے معجزے حضرت عیسیٰ ع بھی ایک پیغمبر تھے انکے معجزے اور کمالات بہت مشہور ہیں۔ انکا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنی پھونک سے مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے
سلیماں ع کا تخت میرے نزدیک ایک کھیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت عیسیٰ ع کا معجزہ میرے آگے ایک معمولی سی بات ہے یعنی شاہانہ شوکت اور پیغمبرانہ معجزے میری نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں۔
اس غزل کے متعلق منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں در یا مرے آگے، صحرا مرے آگے اس پر بھی ایک سال گزر چکا ہے قلعۂ مبارک کے مشاعرے کی غزل ہے یہ دہلی اردو اخبار میں اس تمہید کے ساتھ چھپی ہے:۔
منگل کے دن صبح کو شعرائے قلعہ مبارک اور شہر کے دیوان خاص میں مجتمع ہوئے حضور اقدس اعلیٰ برآمد اور جلوہ فرمائے تخت ہوئے۔ جناب حضرت ولی عہد بہادر زیب افزائے کرسی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا خضر سلطان بہادر اور مرزا جواں بخت بہادر اور شہزادگان والا تبار بعد باریابی مجرا حسب الحکم قصا قوام شرف نشست (باقی صہ ۲۱۵)

ہوتا ہوں میں جس وقت مے ناب سے سرشار　　اٹھتے ہیں حجابات عیاں ہوتے ہیں اسرار
ہے نشہ سے وابستہ گہر ریزیِ افکار　　پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ و صہبا مرے آگے

رہتا تھا شب و روز اسی بات پہ جھگڑا　　ذکر اس کا کرے کوئی مجھے کب تھا گوارا
اب لاکھ کوئی ذکر کرے کچھ نہ کہوں گا　　نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اس کا مرے آگے

اسلام ہو مانع جو مجھے دوڑ کے لے کفر　　ہر چند عقیدت سے جگہ آنکھوں میں دے کفر
حاضر رہے خدمت کو کمر باندھے ہوئے کفر　　ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

میں وہ ہوں کہ جس کام کو چاہا نہ رکا کام　　اس شوخ کے آگے نہ چلا پر نہ چلا کام
حیرت ہے کہ کیوں اپنی تمنا میں ہوں ناکام　　عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

فرقت میں گزرتے تھے جو سو طرح کے صدمے　　کرتا تھا دعا روح کہیں جسم سے نکلے
اب ان سے جو ملنا ہوا دی جان خوشی سے　　خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

موجود ہے جو سوزِ دروں کاش یہی ہو　　ہے جسقدر اب جوشِ جنوں کاش یہی ہو

بقیہ صفحہ ۲۱۴ کا۔ حسب مراتب مقام معزز و مکرم ہوئے۔ بارہ پر ایک بجے تک حضور اقدس جلوہ فرما ہے۔

اب تک ہے جو کچھ حال زبوں کاش یہی ہو ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

نظارہ ء نزع میں بھی دافعِ غم ہے اٹھواتے ہو کیوں پاس سے کیا یہ کوئی سم ہے
ٹھہرو کہ یہ برتاؤ دمِ مرگ ستم ہے گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

وابستہ ہے اس ذات سے جو نام ہے میرا اس امر میں مرزا بھی ہم آواز ہے میرا
ہم کار ہے اور ہمدم و دمساز ہے میرا ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۲۲۲)

امید کیا ہے جو کچھ اپنا ماجرا کہیئے ہماری بات کو کب آپ نے سنا کہیئے
کروں جو شکوہ تو پھر کیا مری خطا کہیئے کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیئے
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیئے

اگرچہ حسن کے جور و جفا ہی زیور ہیں حسین انھیں سے تو آراستہ سراسر ہیں
خدا نخواستہ کب یہ تمھارے جوہر ہیں نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے

جو آشنا ہو وہی آشنا کے گھر جائے نہ بڑھ سکے گا قدم کوئی غیر اگر جائے

جسے ہو جس سے تعلق وہ بے خطر جائے وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیئے

ہزار سینے کو چھلنی بنائے زخمِ سناں کشادِ دل میں مگر تیر کو ہے دخل کہاں
کھلا ہوا ہو جراحت تو ہے وہ راحتِ جاں نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیئے

بشر کو چاہیئے ہو صاف سینہ کینے سے برا ہے ظلم و ستم گو ہو ظلم کے بدلے
مزا تو یہ ہے کہ بن جاؤ دوست دشمن کے جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیئے
جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیئے

کبھی جو بیٹھ بھی جاتے ہیں ہم غزل لکھنے تو بار بار تقاضے یہ ہوتے ہیں دل کے
کہ آج خوب ہی جی بھر کے رویئے دکھڑے کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیئے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیئے

کبھی بیانِ ملالِ دلِ حزیں کیجے کبھی فغانِ جہاں سوز و آتشیں کیجے
کبھی روایت ہجرِ بت حسیں کیجے کبھی شکایتِ رنج گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیئے

نجاتِ غم سے جو دے اس کو اور کیا دیجے نثار کیجئے دل کو یہی صلا دیجے
جو سر اڑائے تو جلاد کو دعا دیجے رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیئے

جو یار پاس نہیں ہے خیالِ یار تو ہے　　تصور اس کا شبِ غم میں غمگسار تو ہے
یہ اک ذریعۂ تسکینِ جانِ زار تو ہے　　نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیئے

جو فرشِ گل نہیں حاصل تو سبزہ زار تو ہے　　چمن نہیں تو مرا سینہ داغدار تو ہے
جو گل نصیب میں اپنے نہیں ہے خار تو ہے　　نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیئے

نجاتِ غم سے نہ ہو گی یقین تھا غالبؔ　　مقامِ شکر ہے سر سے ٹلی بلا غالبؔ
یہی ہے مسلک مرزا بھی میرزا غالبؔ　　سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

(۱۲۳)

با آبرو تو خلق میں کیا خاک ہو گئے　　تھے غرقِ بحرِ شرم کہ پیراک ہو گئے
مشہور اک زمانہ کے چالاک ہو گئے　　رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

تھی مے کشی کی چاٹ جو بیڈھب لگی ہوئی　　پینے میں ہم نے آٹھ پہر کچھ کمی نہ کی
آخر کو رنگ لا کے رہی اپنی مفلسی　　صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

پلٹتے نہیں ہو اب تو ذرا بھی کسی سے تم ہر اک سے پیش آنے لگے دل لگی سے تم
جا جا کے اب تو ملنے ہو ہر آدمی سے تم رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جن کو نہیں ہے عاشقی و عشق کی خبر ہوتے ہیں معترض وہی تاثیرِ آہ پر
گلشن میں دیکھیے اثرِ آہ الحذر کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

دل میں وہ آگ تھی کہ سراپا جلا دیا ہستی کو عاشقوں نے دیا خاک میں ملا
پایا انھوں نے زندگیِ شمع کا مزا پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرتے تھے جی ہی جی میں دمِ رنج و غم گلہ تھا عالمِ خیال ہی میں دم بدم گلہ
جرأت جو پھر بڑھی تو ہوا ہم کو سم گلہ کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مرزا جو دل تھا اس کے لئے جائے بود و باش کرتے ہی قتل اس کو کیا پہلے پاش پاش
ظالم نے خود ہی کر دیا پردہ ستم کا فاش اس رنگ سے اٹھائی کل اسنے اسدؔ کی لاش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

(۲۲۴)

مجھ کو غم سے رہا کرے کوئی　　غم گساری ذرا کرے کوئی
لاکھ دعوے کیا کرے کوئی　　ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حلقۂ زلف حلقۂ زنجیر　　دونوں ابرو ہیں خنجر و شمشیر
جلوۂ حسن وہ کہ برق نظیر　　چال جیسی کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

میرا قاتل وہی نگار سہی　　دو جہاں میں قصور وار سہی
خوں بہا اس کے سر ہزار سہی　　شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اس کی محفل تمام گونگی ہے　　کچھ کہے کس کو تاب اتنی ہے
لب ہلائے مجال کس کی ہے　　بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ذکر ہوتا ہے جا بجا کیا کچھ　　غور کرتے ہیں آشنا کیا کچھ
کہہ گیا دل کا مدعا کیا کچھ　　بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جو لڑے اس سے تم لڑو نہ کبھی
رکھو آزاد زندگی اپنی
کیا ضرورت جواب دینے کی
نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

کوئی تم کو جو دے اذیت بھی
در پے انتقام ہو نہ کبھی
رہنمائیِ خلق ہے اچھی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

جو بظاہر ہیں خرّم و خورسند
وہ ہیں ناشاد تم سے بھی دہ چند
ہے درِ احتیاج کس پر بند
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیوں نہ شکوہ کریں مقدر سے
کھینچ لایا ہے دشت میں گھر سے
رکھئے امید خاک رہبر سے
کیا کیا خضر[1] نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

ان سے جب تک امید تھی غالبؔ
شکوہ سنجی کی خو رہی غالبؔ
حق ہے مرزا کی خامشی غالبؔ
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیا کسی سے گلا کرے کوئی

---

[1] خضر و سکندر کا قصہ مشہور ہے۔ خضرؑ سکندر بادشاہ کو آب حیات کے چشمے پر لے گئے۔ خود تو آب حیات پی لیا اور سکندر کو ان لوگوں کے سامنے لے گئے جو آب حیات پی کر بوجہ طول العمری ضعیف و ناتواں ہو کر ڈھانچ بن کر رہ گئے تھے۔ سکندر نے یہ عالم دیکھ کر آب حیات پینے سے انکار کر دیا۔ یہی تلمیح اس شعر میں ہے۔ (باقی ص۲۲۲ پر)

(۱۲۵)

فلک کے جور سے غم کیا ہے اور ہم کیا ہے — یہ میری تاک میں اور درپئے ستم کیا ہے
جو مے کدہ ہے سلامت تو پھر الم کیا ہے — بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

تمہارے قول ہیں کیا چیز اور قسم کیا ہے — مآل اس کا ستم ہے تو یہ کرم کیا ہے
ذلیل ہوگا کسی دن اسے بھرم کیا ہے — تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

نجومیوں کے خیالاتِ خام ہیں بے سود — نہ سعد و نحس نہ انکے شگون کا ہے وجود
کسی پہ کھل نہیں سکتی مشیتِ معبود — لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

کرے حلف سے بھی وہ بت جو ترکِ جور و جفا — مجھے یقین نہ آیا نہ آئے گا اصلا
خدا سے منحرف اور منکرِ جزا و سزا — نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

ہوئی ہے مہرِ سلیماں کی عدل سے محکم — دکھائی دیتا تھا عالم یہ جام پر تھا بھرم
انھیں صفات سے دونوں کا ہے وجود عدم — وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے ہمدم

بقیہ صفحہ ۲۲۱ کا :- فرماتے ہیں خضر نے سکندر سے کیا کیا؟ یعنی کچھ نہیں کیا۔ گویا خضر کی رہنمائی سے بھی سکندر کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کوئی اب کسے رہنما بنائے۔

وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

بلا کسی نے کہا ہے کسی نے دام اسے کسی نے دی اسے تشبیہ نیشِ عقرب سے
کھلے نہ جب تو معما اسے نہ کیوں کہیے کہ تورات جو کاٹے تو سانپ کہلائے
کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خم بخم کیا ہے

جدید طرز کا اردو زبان میں بانی وہ فارسی کہ جسے سن کے دنگ ایرانی
سخن وروں میں ہے مرزا وہ فردِ لاثانی سخن میں خائر غالب کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

۱۲۶

کہوں کیونکر خوشی نکلی نہ دل سے رنج و غم نکلے یہ سب نکلے مگر افسوس کیونکر یہ الم نکلے
نہ پوری حسرتیں نکلیں نہ ارماں یک قلم نکلے ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہوا جلاد کو کیا وہم رو کا کس لئے خنجر ہے جب تک نے خوں قاتل کے سر سو خوں بہا کیونکر
نہیں اتنا لہو باقی کہ خنجر لب ہی کر لے تر ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اسکی گردن پہ
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

کبھی ہم بھی تھے تیرے سایۂ دیوار میں ساکن رسائی پر ہماری رشک کرتے تھے سب انسی و جن

---

[۱] اس غزل کے اکیس زائد شعر نواب احمد سعید خاں صاحب کے ہاتھ کے تحریر کردہ مخطوطہ حصہ اول میں خطوط اول موسومہ مرزا علاؤالدین احمد خاں صاحب بہادر میں درج ہیں۔

ہمیں جب تو نے اٹھوایا عدو سے یاد ہے وہ دن نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ترے گیسوئے پیچاں کے مقابل کب ترا قد تھا زمانہ نے مگر اک فتنۂ محشر اسے سمجھا
غنیمت ہے کہ اس پیچیدگی نے رکھ لیا پردا بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

عجب کیا ہے ہمارا خط اگر اسکو پسند آئے پھڑک جائے عبارت دیکھکر اور قدر فرمائے
نہ پہونچیں ہم تو کیا تحریر ہی اپنی پہنچ جائے مگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

ہوئی ہر رنگ میں جب پیر میخانہ کو ناکامی نہ دور جام سے حاصل ہوا کچھ غیر بدنامی
نظر جب صاف آئی میکشوں کے ظرف میں خامی ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

کریں کیا خاک حسرت حالِ درد و غم سنانے کی کہاں نوبت کسی کو اپنے زخم دل دکھانے کی
کریں کیا شکوہ کچھ حالت ہی ابتر ہے زمانے کی ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ الم نکلے

اگر ہم شمع سوزاں ہیں تو وہ آتش کا پرکالا جلانا خاصہ اس کا ہماری زندگی جلنا
اسی کا پرتو ہے اپنا سامانِ بقا گویا محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

سرِ منبر کیا کرتا تو ہے مے کا بیاں واعظ
بیانِ حرمتِ مے میں ہے مشہورِ جہاں واعظ
یہی حیرت ہے مرزاؔ کو بھی کیونکر پہنچا وہاں واعظ
کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۱۲۷

ساقی سیاہ مست ہے تو لطف خاک ہے
قصہ ہی پھر تو پینے پلانے کا پاک ہے
ساقی کی آنکھ پر ربطِ صہبا کی تاک ہے
مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے
رہتی ہے اس کو خنجر و پیکاں کی جستجو
آٹھوں پہر ہے ذوقِ جراحت کی گفتگو
ہردم سنان و تیر کا نقشہ ہے روبرو
جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
وادیِ تنگ اب ہمیں بھاتا نہیں اسدؔ
نظروں میں اپنی دشت سماتا نہیں اسدؔ
مرزاؔ بھی راہِ چارہ بتاتا نہیں اسدؔ
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

۱۲۸

اس کی ہوا میں ہر گلِ تر دل فگار ہے
رخ کا پسینہ رو کشِ عطرِ بہار ہے

بوئے بدن سے بادِ صبا مشکبار ہے　　جس جا نسیمِ شانہ کشِ زلفِ یار ہے

نافۂ دماغ آہوئے مشکِ تتار ہے

دل جیتے جی اٹھائے گیا سر پہ بارِ شوق　　ہم خاک میں ملے تو ہوا انتشارِ شوق

کیونکر فضائے دشت نہ ہو اب شکارِ شوق　　ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق

گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

آنکھوں سے کون پردہ نشیں ہو چھپا ہوا　　کس کے خیالِ دید میں سکتہ سا ہو گیا

کیوں اس طرح کیا ہے تہیہ تلاش کا　　کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو یا خدا

آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

ہے بس کہ شوخ چشم بڑا مدعا علیہ　　تسلیم کیوں کرے گا خطا مدعا علیہ

دے گا جواب دیکھئے کیا مدعا علیہ　　دلِ مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ

نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

تیاریِ سفر میں ہے غنچوں کو پیچ و تاب　　پا در رکاب ہیں یہ گلوں کو ہے اضطراب

پتے اتر کے شاخ سے کرتے ہیں پا تراب　　چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب

اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

ہو کیوں نہ انتظار سے دل بستگی مجھے　　تسکین اس خیال ہی سے ہے بڑی مجھے

ایفا کی گو نہیں ہے کچھ امید بھی مجھے　　پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے

وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

اب تک تو گھر کی بھی نہ تجھ پر پڑی نظر
ذروں کی آنکھیں دیکھ کہیں ہوں پردہ در
لیلی نہ پھرنا چاہیئے بے باک اس قدر
بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے

بے کار ہے مرقعِ دل واہ کیا کہی
آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو ہو اس سے آگہی
ہو پاس ایسا آئینہ اور پھر یہ گمرہی
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بیدماغ آئینہ تمثال دار ہے

اٹھنے کو ہے چمن سے عملداریِ خزاں
تنکا بھی پھر نہ آئے گا تجھ کو نظر یہاں
غافل یہ کثرتِ خس و خاشاک پھر کہاں
اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

مرزا کی طرح کچھ بھی نہیں اس کو احتیاط
یہ غم کدہ اور اس میں یہ فرحت یہ انبساط
یہ جوشِ حرص اور قویٰ میں یہ انحطاط
غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

(۱۲۹)

تو وہ حسین ہے کہ خود آرا کہیں جسے
شاہانِ حسن تاجِ سر اپنا کہیں جسے
ہے اور کون حسن میں یکتا کہیں جسے
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حیراں ہے جو الفت حسن و جمال میں — اک انقلاب ہے دلِ خستہ کے حال میں
سکتہ ہوا تصورِ ذوق وصال میں — حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہِ سویدا کہیں جسے

دل کو کیا ہے عشق نے کس غم میں مبتلا — کرتے ہیں اسکو بیم و رجا رات دن فنا
آنکھوں کو کس نے شوق نظر کا لگا دیا — پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا[1]
افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

کیونکر جنون و جوشش وحشت کو ٹالیے — وحشی کو کس طرح دمِ غربت سنبھالیے
دل کا غبار اور تو کیونکر نکالیے — سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

آنکھوں میں ہے سمایا ہوا بحرِ بیکراں — اس زور کا ہے مدّ و تلاطم کہ الاماں
دنیا کا حال کیا ہو اگر اشک ہوں رواں — ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

پھیلی ہوئی ہو چاندنی یا تیرہ ابر ہو — دونوں ہیں بے طرح متقاضی کہ مے ہو
ہوتی نہیں بسر جو شبِ غم شراب دو — درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

جس کے برائی دل میں ہو اچھا وہ کیا کہے — کچھ بھی گلہ نہیں ہے اگر ناسزا کہے
مرزا سے صبر سیکھ کہ دنیا بھلا کہے — غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے

[1] حاشیہ صفحہ ۲۲۹ پر

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

(۱۳۰)

سامانِ مرگ پہلے مہیا کرے کوئی — پھر تجھ سے گفتگو کی تمنا کرے کوئی
بیٹھا خموش یوں تجھے دیکھا کرے کوئی — جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

کیونکر ہو خاکِ عاشقِ جانباز سے مفر — اس کو ہوا لئے ہوئے پھرتی ہے دوش پر
وادیِ نجد پر ہی نہیں صرف منحصر — عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرّۂ لیلیٰ کرے کوئی

پژمردہ دل میں تھی جو تمنائے التفات — آخر وہ آج کرتے ہوئے آئے التفات
لیکن یہ جان لیں جو ہے دعوائے التفات — افسردگی نہیں طرب افزائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

گھٹتے ہیں صبر و ضبط میں آٹھوں پہر مجھے — دل کھول کر بہانے دے آبِ اشکِ تر مجھے
چھوڑ ان نصیحتوں کو نہ گھونٹ اس قدر مجھے — رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے

حاشیہ صفحہ ۲۲۸ کا ۔ غالب صاحب سیف الحق سیاح کو ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں بھائی سیف الحق تمہارا خط پہنچا قاضی صاحب بڑودہ کو معافیہ لکھو اگر کوئی وجہ اپنے پر انکے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کروا تا جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں تم برا نہ مانو کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اس نے برا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو ؎

غالب برا نہ مان جو دشمن بُرا کہیں — ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

دل خستگی ہزار طرح رونما ہوئی	باایں ہمہ انھیں نہ توجہ ذرا ہوئی
میں نے قبا جو چاک نہ کی کیا خطا ہوئی	چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی

کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

وادی کے سامنے ہے چمن کا چراغ گل	بادِ بہار کا نفسِ سرد سے ہے غُل
کیونکر نہ رشکِ گلشنِ جنت ہو دشت کل	لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل

تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

تیری شعاعِ حسن ہے اک تیرِ چشم دوز	مطلق نہیں ہے آنکھ کو تابِ نظر ہنوز
ہم دیکھیں کس طرح تجھے اے مہرِ نیم روز	ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

وحشت زدوں کو کیا خبرِ فرقِ پا و دست	اطفال گردِ سر ہیں وہ ہیں اپنی دھن میں مست
سر پھوٹنے کا مفت میں ہوتا ہے بندوبست	ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست

نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

ہم چاہتے ضرور کچھ اپنے خدا سے عمر	بڑھ جاتی شاید اور دعا و دوا سے عمر
تنگ آگئی مگر ترے عہدِ وفا سے عمر	سر بر ہوئی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

آوارگیِ دشت ہے وحشت زدے کا شغل	حسرت کشی ہے ضعف کے مارے ہوئے کا شغل

دامان و جیب پھاڑنا بھی ہے مزے کا شغل — بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

بے کار ہے سخن سے طبیعت کا خیز و میز — انشاؤ اختراع سے بے جا نہیں گریز
بے سود ہے نتیجۂ افکارِ طبعِ تیز — ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

روشن کلام. دہر سے کافور ہے اسدؔ — گویا چراغِ مردہ و بے نور ہے اسدؔ
مرزا بھی اب یہ کہنے پہ مجبور ہے اسدؔ — حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

۱۳۱

یہ داغ دکھا کر جو گلستاں میں ہنسا ہے — عشاقِ دل افگار کے نزدیک خطا ہے
نادم ہے کہ غرقِ عرقِ شرم ہوا ہے — شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ پر درد نظر گاہِ حیا ہے

ہے بو لے حنا سے یہ انھیں مستیِ بسیار — مطلق نہیں حالِ دلِ غمگیں سے خبردار
فرصت ہی نہیں ہاتھوں کے نظارہ سے زنہار — دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

کم آتشِ سوزاں سے نہیں حسرتِ دل بھی — جلنا یہی اپنا ہے تو مٹ جائے گی ہستی

سینے میں تمنا نے عجب آگ لگا دی　　شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی

جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

تصویر کی کیا قدر کریں غیر ہیں بدذوق　　ہم محو ہیں اس درجہ کہ رکھتا نہیں حدِ ذوق

جا سکتا نہیں آئینہ سے تا بہ ابد ذوق　　تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق

آئینہ بانداز گل آغوش کشا ہے

قمری کی صداؤں سے ہے ہر سرو ہی دنگ　　بلبل کے اس انداز سے ہر غنچہ ہے دل تنگ

دونوں میں ذرا سوزشِ پنہاں کا نہیں ڈھنگ　　قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ

اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

عادت نے تری پست کیا ہمت دل کو　　مجبور بدلنا ہی پڑا حالتِ دل کو

بڑھنے نہ دیا ولولہ و جراتِ دل کو　　خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو

معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

وہ لاکھ جفائیں کرے دے لاکھ اذیت　　دشوار ہے آسان نہیں ترکِ محبت

کچھ پاسِ زباں ہے ہمیں کچھ پاسِ مروت　　مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

ہے قاتلِ عشاق پریشان گزشتہ　　باقی ہے ابھی اس میں وہی شانِ گزشتہ

کرتی ہے عیاں قتل کے سامان گزشتہ　　معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ

تیغِ ستم آئینہ تصویر نما ہے

نظروں میں شبِ تار سے بدتر ہے سحر بھی　　شائق ترے انوار کا دل بھی ہے جگر بھی
روشن ہیں ترے نور سے دیوار بھی در بھی　　اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

تقدیر ہی قدرت نے ہمیں دی ہے کچھ ایسی　　ہم پر نہ پڑی ہے نہ پڑے تیری تجلی
محروم بجز میرے نہیں جلوے سے کوئی　　اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

جاتا تو ہوں دنیا سے مگر با دلِ ناشاد　　کیا کیجئے بے وقت پڑی موت کی افتاد
ارمان بھرے دل کی بھی ہے تجھ سے ہی فریاد　　ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

تو اہلِ زمانہ پہ جو مایل نہ ہو غالب　　یہ حسرت و حرماں کبھی حاصل نہ ہو غالب
مرزا کے سوا غیر کا قائل نہ ہو غالب　　بے گانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

(۱۳۲)

غلمان کی یہ شکل نہ صورت ہے حور کی　　سمجھے گا اسکو کیا کوئی ہے بات دور کی
اک بہرِ امتحاں تھی ضیا کوہِ طور کی　　منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

ہر نظارہ اہلِ جہاں کے جماؤ ہیں انداز ہے ادا ہے کرشمے ہیں چاؤ ہیں
پھولوں کی بدھیاں ہیں بدن پر جو گھاؤ ہیں اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

وہ مے کہاں کی جس سے نہ لذت اٹھا سکو دیکھو نہ جس کو خود نہ کسی کو دکھا سکو
خود جا سکو جناں میں نہ گھر بیٹھے پا سکو واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

پھر ہو رہا ہے مجھ کو قیامت کا سامنا ہے دغدغہ وہی جو کبھی زندگی میں تھا
یہ جان کر کہ آج ہے دن عدل و داد کا لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

پھرتی ہے باغ باغ نہ غم ہے نہ کوئی رنج گانے لگی ترانۂ نو بے رباب و صنج
گو پائے گا اس کو زرِ گل سے کوئی گنج آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

مانا کہ یہ نگاہ سے ڈالے ہوئے تو ہیں عزت کو لیکن اپنی سنبھالے ہوئے تو ہیں
اُمّ القریٰ کی گود کے پالے ہوئے تو ہیں گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

موسیٰ ہی تھے ملا ہے جنھیں یوں کھلا جواب دیکھیں تو دیتے ہیں ہمیں پردے سے کیا جواب
خطرہ نہیں کسی کو اگر مل گیا جواب کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

مثلِ زبانِ شمع زباں میں ہے وہ اثر　　پھونکا اسے کسی سے ہوئے ہم سخن اگر
پر کار آگ کا تمہیں کہتا ہے ہر بشر　　گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

مرزا یہ شوق حج کا ہے جس طرح اب ہمیں　　اس وقت تھیں یونہی دلِ غالب میں حسرتیں
آخر یہ بات کہہ گیا وہ آکے جوش میں　　غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں

حج کا ثواب نذر کروں کا حضور کی

(۱۳۴)

اس کو جو غمِ گردشِ ایام بہت ہے　　اس واسطے جویائے مے و جام بہت ہے
مے خواری و رندی میں یہ بدنام بہت ہے　　غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے

یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

مجھ رندِ بلانوش کو چسکا ہے یہ مے کا　　ہو بادہ سرجوش ہی اس کی نہیں پروا
میں شوق سے لونگا جو تلچھٹ بھی وہ دیگا　　کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ

ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہِ جام بہت ہے

لے یہ غزل اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب شاہ ظفر نے حج کیلئے جانے کا ارادہ کیا تھا جس کی رپورٹ رزیڈنٹ دہلی نے بھیجی تھی مرزا غالب نے ہمراہ جانے کی خواہش اس مقطع میں ظاہر کی ہے سے

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں　۔　حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

پنہاں نہیں اب دام گلستاں کی زمیں میں
خطرہ ہی نہیں کوئی دل گوشہ گزیں میں
چبھتے نہیں اب خارِ الم قلبِ حزیں میں
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

لالچ سے جو تکلیف عبادت کی اٹھائی
اس عابدِ ناداں نے عبث عمر گنوائی
کیا فائدہ اعمال میں جب ہو نہ صفائی
کیا زاہد کو مانوں وہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

آزادہ روی شیوہ بتاتے ہیں جو انساں
معلوم نہیں سمجھے ہیں کیا جی میں وہ ناداں
آزاد تو ہو ہی نہیں سکتے کسی عنواں
ہیں اہل خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

پینے میں لگے بادہ گلفام کے دھبے
ان سے خلل آ جائے نہ ارکان میں حج کے
فرصت ہیں ذرا بیٹھ کے دھو لوں انھیں پہلے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

تردید نہ کی اس کی کبھی میں نے کہا جو
مجھ پر وہ عنایت کی نظر رکھتے ہیں اب تو
حیرت ہے یہ برتاؤ ہو اور وصل نہ پھر ہو
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

میں یہ نہیں کہتا مجھے مرنا نہیں اے مرگ
بچ جاؤں تو کچھ حرج بھی تیرا نہیں اے مرگ
حاشا کہ مجھے جان کی پروا نہیں اے مرگ
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

کیا دل کش و دلچسپ ہیں مرزا کے ترانے
بخشی ہے عجب طبع رسا اس کو خدا نے
مانا ہے اسے راہنما سب شعرا نے
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے

شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

۱۳۴

کیا کیجئے کہ دل ہے پریشاں کئے ہوئے
آئینہ دار ہے مجھے حیراں کئے ہوئے
ہے انتظار آمد جاناں کئے ہوئے
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

دل کو تو چشم تر نے دیا اشکِ خوں میں کھو
کیا خاک مجھ سے کوئی نیا انتظام ہو
کر دوں گا پیش کش وہی حاضر ہو گھر میں جو
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو

عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

مدت کے بعد جوشِ جنوں نے کیا کرم
تابِ سکون و صبر گئی دل سے یک قلم
وحشت کی روک تھام نہ اب کر سکیں گے ہم
پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم

برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

سینے میں پھر وہ آگ بھڑکنے لگی کہ بس
پھر جل کے خاک ہوگا تنِ زار مثل خس
پھر ضبط آہ پر نہ رہا دل کو دسترس
پھر گرم نالہائے شرر بار ہے نفس

مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

کیا پوچھتے ہو کیا ہے غضب ہے بلا ہے عشق
سر سے مرے ٹلے گا نہ اب تک ٹلا ہے عشق

دل کیا کر اب تو دیپئے جاں برملا ہے عشق
پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق

سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر دل میں شوقِ دید سے ہے درد جاں گسل
پھر اشکِ خوں بہاؤں گا آنکھوں سے متصل

دکھلاؤں گا وہ رنگ کہ مانی ہو منفعل
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخون دل

سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

پیش آ رہا ہے عشق میں اک واقعہ عجیب
بیٹھے بٹھائے پھنس گئے آفت میں دو غریب

کیا دور ہے کہ دونوں میں چھڑ جائے عنقریب
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب

نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

وحشت میں ڈھونڈ رہی ہے جو رسوائیوں کی لے
ذلت کے مرحلے کو کیا چاہتا ہے طے

کھل کھیلنے کے اب تو تقاضے ہیں پے بہ پے
پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے

پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر ہے مریض عشق کو تیمار کی طلب
پھر اس دل غمیں کو ہے غم خوار کی طلب

الفت کو پھر ہے گرمی بازار کی طلب
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب

عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

ہے رنگ و بوئے گل کا جو پیشِ نظر خیال
گلشن میں جا کے مست ہیں پھر بلبل سیر خیال

لِ گشت میں جما ہوا ہے پھر اُدھر خیال   دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

سرنامہ اس کے خط کا ہے اس درجہ دل ربا   جس کے ہر ایک حرف پہ ہیں جانِ دل فدا
مضمونِ شوق دیکھئے لاتا ہے رنگ کیا   پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جان نذرِ دل فریبیِ عنواں کئے ہوئے

تسکین سیرِ باغ سے کیا ہو گی ہم نفس   بے یار ہیں نظر میں گلِ تر بھی خار و خس
بے چین ہو رہا ہوں کہ دل پر نہیں ہے بس   مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

بے وجہ تو نہیں ہوں میں آوارہ کو بکو   پھرتا ہوں تیغ زن کے تجسس میں چار سو
تیغ نگاہ کی ہے ان آنکھوں کو جستجو   چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

مرغوبِ چشمِ شوق نہیں روئے مہر و ماہ   اس گل کی بزمِ عیش کی دل ڈھونڈھتا ہے راہ
کب سامنے ہو دیکھئے ساقی کی جلوہ گاہ   اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

تا چند انتظار کا دکھ جھیلتے رہیں   کب تک رہین چارۂ احباب کے رہیں
تا چند یوں جدا در دلدار سے رہیں   پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

طاقت نہ وہ خیال ہیں باقی نہ اب وہ سن
وہ دن گئے کہ چین نہ پڑتا تھا یار بن!
رہتے تھے اس کی یاد میں اور دل تھا مطمئن
جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے
کیا سہل بات تھی کہ یہ سیلاب رک سکے
روکا یہ جوش جس نے وہ مرزا ہمیں تو تھے
اب بھی ہیں اپنی آنکھوں میں دریا بھرے ہوئے
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

(۱۳۵)

جفائے یار تسلّی ہے اک جہاں کے لئے
خبرِ خوشی کی ہے آزادیِ واماں کے لئے
ہوئی ہے وجہِ تسلی دلِ تپاں کے لئے
نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے
غذائے غم نو دلِ بے قرار و محزوں ہے
جگر کی تاک میں وہ دیدۂ پرافسوں ہے
پڑی وہ لوٹ کہ حالت مری دگرگوں ہے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کے لئے
خطا معاف یہ ہے التماسِ خلق اے خضر
تمھیں نہیں ہے ذرا بھی تو پاسِ خلق اے خضر
چھپے ہو تم یہ تمھیں ہے ہراسِ خلق اے خضر
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

یہاں تلک مرے دل میں ہوئی ہے کثرتِ رشک
کہ بات بات سے ظاہر ہے اب علامتِ رشک
کسی کو غیر کی راحت پہ ہو گی عادتِ رشک
رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک

بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

وہ کشتنی کہ جو قاتل سے رات دن ہو قریں
انھیں کو اس سے جدا کر کہ ہو مجھے تسکیں
کبھی تو دور سے ہو آزمایش انکی کہیں
فلک دور کہ اس سے مجھے کہیں ہی نہیں

درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

پڑا ہوا تو ہوں زنداں میں بستۂ زنجیر
قرینہ یہ تھا کہ کرتا نجات کی تدبیر
مگر مجھے تو یہ دُھن ہے کہ گھر کروں تعمیر
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر

کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

پڑا ہوا تھا میں دھونی اس آستاں پہ رمائے
اس آرزو میں کہ درباں کو ترس آجائے
اسے بھی کوئی خصومت رہی کہ مجھ کو اٹھائے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے

اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ؔ اس شعر کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں "اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو غالب کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر پروانہ تھے۔ آغاز مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے مگر اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو واقعہ غالب نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی۔ ایک یہ کہ پاسبان نے قاتل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قاتل پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے۔ اسکے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔"

سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرز عمل | کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل
نہ کیوں ہو حد تغزل میں رہ کے جی بے کل | بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

ملا ہے جو طرب و عیش اسکو قسمت سے | بھلا وہ اس کے سوا ہے نصیب اور کسے
مٹا دیا حسد و رشک کو بھی قدرت نے | دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

یہ ذکر خیر مرے لب پر آگیا کس کا | بھرا سرور سے دل اور جگر ہوا ٹھنڈا
مجھے بیان پر اپنے ہے وجد کیوں اتنا | زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا

کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

اسی کی شان کے شایاں ہو شان و شوکت ملک | اسی کے واسطے موزوں ہو جاہ و حشمت ملک
رہے ہمیشہ یوں ہی برقرار ثروت و ملک | نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک

بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لئے

ہر اک بشر کے لئے عیش کی ہے افزایش | خدا کے فضل سے آیا ہے دور آسایش
نئے طریق سے ہر شے کی ہو گی زیبایش | زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرایش

بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ابھی تو مدح کی تمہید و ابتدا ہی ہے | نہ مدح لکھی گئی ہے نہ میں نے لکھی ہے
ابھی کہاں مری طبع رسا نے بس کی ہے | ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لئے

عجیب ڈھنگ نکالا ہے مدح گوئی کا — غزل ہی شنے میں دکھایا ہے اس نے رنگ نیا
طبیعت اس کی ہے جدت پسند اے مرزا — ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

(۱۳۶)

کم ہے غیروں سے اگر مہر و وفا اور سہی — کوئی برتاؤ مروت کا نیا اور سہی
میری ایذا سے جو دل خوش نہ ہوا اور سہی — میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

رات دن گریہ ہے اور آٹھ پہر نالہ و آہ — سوگ تم نے تو کچھ اس درجہ منایا کہ پناہ
مر ہی جانے دو اگر مر ہی گیا ہے گمراہ — غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

کبر و نخوت کی زمانے میں دہائی کیوں ہے — دل میں ناحق ہوسِ خام پکائی کیوں ہے
خود نما کیوں ہو خودی سر میں سمائی کیوں ہے — تم ہو بت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

یہ تو مانا کہ حسینوں کی نہیں کوئی کمی — آن بان ایسی کسی میں کبھی دیکھی نہ سنی
منہ حسینانِ ارم آ کے ملائیں تو سہی — حسن میں آپ سے بڑھ کر نہیں ہونگی کبھی

حور کا شیوۂ انداز و ادا اور سہی

کیا قیام اور قعود اور ہے سجدہ کیسا — سر مرا جھک نہیں سکتا ہے ترے در کے سوا

تھا جو بے چین تو ہر پھر کے اُدھر ہی پہونچا — تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا

کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کیا انوکھا چمن خلد بریں ہے واعظ — باغ دیکھے ہی نہیں تو نے یقیں ہے واعظ

تیری باتوں کا ٹھکانہ بھی کہیں ہے واعظ — کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ

خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

یاں تو دل کھول کے ارمان نکالیں یارب — تنگیِ دہر کی کچھ داد تو پالیں یارب

سیر کا لطف تو جی بھر کے اٹھالیں یارب — کیوں نہ فردوس میں دوزخ بھی ملالیں یارب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کر دیا ہے غمِ ہجراں نے مرا حال زبوں — بڑھتے بڑھتے خفقاں پہنچی ہے نوبت بر جنوں

دیر مرنے میں لگے لگی جو کھلائی افیوں — مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں

زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی

طبعِ دیوان سے جو غالبؔ نے فراغت پائی — یار و احباب نے مرزا نئی آفت ڈھائی

کی غزلِ نظم تو یوں لب پہ شکایت آئی — مجھ سے غالبؔ یہ علائیؔ نے غزل لکھوائی

ایک بیدادگرِ رنج فزا اور سہی[1]

---

[1] غزل نمبر ۱۳۶۔ دیوان مطبوعہ میں نہیں ہے۔ اردوئے معلیٰ حصہ اول رقعہ موسومہ نواب امین الدین احمد خاں صاحب بہادر میں درج ہے ۱۲

شکوۂ درد بھی اک گونہ خطا ہے تو سہی نالۂ و آہ سے اظہارِ جفا ہے تو سہی
صبر میں اُف بھی منافیِ رضا ہے تو سہی آپ نے مسئیِ الضُّر کہا ہے تو سہی
یہ بھی یا حضرت ایوب گلا ہے تو سہی

ہم نشینوں کو ہے کیا میری مصیبت کی خبر کرتے ہیں صبر کی تلقین مجھے آٹھ پہر
دل ہی تو ہے مرے سینے میں نہ کوئی پتھر رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر
ذہن میں خوبیِ تسلیم و رضا ہے تو سہی

آس باقی ہے تو برسوں ہمیں بہلائے گی عمر سبز باغ آٹھ پہر فکر میں دکھلائے گی عمر
داد ملنے کے لئے گو یونہی تڑپائے گی عمر ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی

کس کا چارہ فقط الزام سے ہوتے ہیں بری کون اٹھاتا ہے مریضوں کے لئے دردسری
منہ نہ کھلواؤ کہ احباب کی ہے پردہ دری دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی ایک تمنائے دوا ہے تو سہی

ہم سے برتاؤ ہے جو کچھ اسی قابل ہم تھے کہئے بدعہد و جفا کار اسے کس منہ سے
بے مروّت ہے وہ کیونکر کوئی انصاف کرے غیر سے دیکھئے کیا خوب نباہی اس نے
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

گو کہ واقف نہیں تقدیر کے احوال سے میں
خطِ قسمت نہیں پڑھ سکتا کسی حال سے میں
یوں لگاتا ہوں پتہ اپنے ہی افعال سے میں
نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال سے میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

جس طرح صبر سے مرزا نے گزاری غالب
زندگی کاٹو اسی طرح سے تم بھی غالب
جان دیتے ہی کسی روز بنے گی غالب
کبھی چل جائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

قطعہ تاریخ تکمیل اوراق ہذا

کی شرحِ نظمِ غالب تضمین میں جو مرزا
ظاہر ہوئے معانی حل ہو گئے مطالب
جی میں خیال آیا تاریخ اس کی لکھئے
بولا سروشِ غیبی روحِ کلامِ غالب
۱۳ ۵ ۴۸

نوٹ :- یہ غزل ۱۳۷۵ھ نواب احمد سعید خاں صاحب طالب رئیس دہلی کا عطیہ ہے فرماتے تھے کہ میں ہر وقت پھوپھا جان (غالب) کی خدمت میں حاضر باش تھا نیا کلام اپنی یادداشت میں لکھتا تھا اور بجنسہٖ یہ غزل ہے۔

تمام شد

ضمیمہ

تضمین بر غزل فارسی مولانا جامیؒ

کیا شوق زیارت نے پریشاں یا رسول اللہ — ہوا ہوں درد سے سخت حیراں یا رسول اللہ
خدا کیواسطے کچھ کیجئے درماں یا رسول اللہ — تنم فرسودہ جاں پارہ ز ہجراں یا رسول اللہ

دلم پر درد آوارہ ز عصیاں یا رسول اللہ

نہ دل میں صبر کی طاقت نہ جانمیں ہے شکیبائی — نہیں اب بار فرقت کے اٹھانیکی توانائی
دکھاؤ شکل نورانی بناؤ مجھ کو سودائی — شب و روز از شکیبائی ز حد گشتم تمنائی

بخلوت سوئے من آئی خراماں یا رسول اللہ

ہوئے قدرت سے چاروں یار ایسے آپکے ہمدم — محبت کے تھے چاروں حرف گویا متصل باہم
خدا نے انکو اسرار نبوت کا کیا محرم — بصدیقت خریدارم عمر را دوست میدارم

بعثمان و علی آرم فدا جاں یا رسول اللہ

نہیں اسوقت بجز تیرے کوئی میرا مونس ہمدم — سہارا ہے تمہاری ذات کا یا سرور عالم
ندامت سے ہے دردا ٹھتا دلِ ناکارہ میں پیہم — ز کردہ خویش حیرانم سیہ شد روز عصیانم

پشیمانم پشیمانم پشیماں یا رسول اللہ

غمِ فرقت میں برسوں کی ہے آنکھوں سے گہرباری	متاعِ مال و زر جتنی جسقدر برباد کی ساری
نہیں کچھ پاس قرباں کرنے کو ہے سخت لاچاری	چہ سوئے من گذر آری منِ مسکین زنا داری

نثارِ نقشِ نعلینت کنم جاں یارسول اللہ

چلا سوئے عدم مرزا نہایت بے سروساماں	نہیں ہے ساتھ توشہ آخرت کا کچھ بجز عصیاں
ہے اتنی عرض یا مولا مری جاں تم پہ ہو قرباں	چوں بازوئے شفاعت را کشائی بر گنہگاراں

مکن محروم جامی را دراں آں یارسول اللہ

تضمین بر غزل مولانا منشی حبیب الدین صاحب سوزاں

دکھاؤ اب تو روئے عالم آرا یارسول اللہ	بنالو اپنا دیوانہ خدارا یارسول اللہ
عنایت کی نظر ہوں ہوں تمہارا یارسول اللہ	ہمیں ہے ذات اقدس کا سہارا یارسول اللہ

تمہارے بن نہیں کوئی ہمارا یارسول اللہ

کہیں جلدی نقاب اپنے رخ پر نور سے الٹو	کسی دن خواب میں آکر ہی مجھکو شرف بخشو
نہایت مضطرب شوقِ زیارت نے کیا مجھکو	کہوں میں تم سے کیا تم محرم رازِ الٰہی ہو

تمہیں معلوم ہی احوال سارا یارسول اللہ

قدِ بے سایہ نے کردی ہے توحیدِ خدا ثابت تمہاری شان سے ہوتی ہے شانِ کبریا ثابت
اشاروں میں ہی دعوائے نبوت کو کیا ثابت بمعجز شق القمر کے معجزے سے ہوگیا ثابت

بلندی پر تمہارا ہے ستارا یا رسول اللہ

تمہارا ذکر جاری ہے زباں پر میری صبح و شام یہ ہے وہ ورد جس سے دور ہوتے ہیں غم و آلام
تمہارے نام سے ہے دلکو راحت جانکو آرام لیا کیجئے نہ کیونکر بیٹھتے اٹھتے تمہارا نام

تمہارا نام لگتا ہے پیارا یا رسول اللہ

بھروسا ہے تمہارا خواجۂ ہر دو سرا ہم کو قیامت میں گناہوں کا نہیں کھٹکا ذرا ہم کو
شفاعت کر کے بیشک آپ لینگے بخشوا ہم کو اگرچہ کیسے ہی عاصی ہیں بخشے گا خدا ہم کو

ذرا بھی کیجئے گا گر اشارا یا رسول اللہ

زیارت سے نہ روضہ کی مشرف ہوگا یہ جبتک نہیں ممکن سنبھلنا اس نحیف و زار کا تبتک
گزاری جس طرح گزری پریشانی سے یاں ابتک مدینے میں مجھے پاس اپنے اب بلوائیے کبتک

پھروں گا ہند میں میں مارا مارا یا رسول اللہ

بھلائی پر نہ مجھکو نفس نے ہونے دیا قادر بدی میں ہوگیا یکتا نکوئی میں رہا قاصر
طلبگار حمایت اب ہوا سرکار میں حاضر کرو اسوقت بد میں دستگیری تم کریں آخر

برا ہوں یا بھلا ہوں ہوں تمہارا یا رسول اللہ

ہے گستاخی سراسر شکوۂ سوزِ نہاں کرنا — ادب کے ہے خلاف آہ و بکا شور و فغاں کرنا
فضول ایک امر ہے اظہارِ بیتابیٔ جاں کرنا — عبث ہے تم سے اب ہر وقت دردِ دل بیاں کرنا
غمِ پنہاں ہے تم پر آشکارا یا رسول اللہ

ہمیشہ ذاتِ اقدس کا رہا سر پر مرے سایہ — تسلی کی کبھی گر میں ہجومِ غم سے گھبرایا
جہاں پر نیم جاں پہنچا تمہیں موجود واں پایا — تصدق آپ کے الطاف کے لبیک فرمایا
کبھی گر روزِ غم میں نے پکارا یا رسول اللہ

زیارت کی نکال اے جذبِ دل اب تو ہی کوئی راہ — کسی دن اے ہوائے شوق اڑا لے چل مجھے ناگاہ
میں اور یوں سرورِ عالم کے در سے دور رہوں ہائے آہ — مجھے اور حکم بود و باشِ ملکِ ہند یا اللہ
میں اور یوں زیرِ فرمانِ نصارا یا رسول اللہ

نہیں ہے آپکے مرزا میں باقی طاقتِ ہجراں — فزوں ہر دم بدم اس پر ہجومِ حسرت و ارماں
مدینہ میں بلالو یا نبی اتنا کرو احساں — دیارِ ہند ہے کیونکر لگے اسمیں دلِ سوزاں
مدینہ ہے نہ مکہ نہ بخارا یا رسول اللہ

۴

تضمین بر سلام میر وحید صاحب مرحوم لکھنوی

نام ہو جس کا علی نام خدا ایسا تو ہو　　ہو جسے معراج دوشِ مصطفٰے ایسا تو ہو
نام پر جس کی نصیری ہیں خدا ایسا تو ہو　　خلق کے بیڑے کا حامی ناخدا ایسا تو ہو

جس پہ دھوکا ہو خدا کا ناخدا ایسا تو ہو

عاشقِ نام خدا اہلِ سخا ایسا تو ہو　　ہو گئے جس کے پسر حق پر فدا ایسا تو ہو
جو کرے یوں بندگی حق کی ادا ایسا تو ہو　　گھر لٹایا شاہ نے وعدہ وفا ایسا تو ہو

دے دیا سجدہ میں سر عشقِ خدا ایسا تو ہو

جسم بھی جوہر سے تھا حق نے بنایا آپ کا　　سایہ کی جا پڑتی تھی جسم منور سے ضیا
درحقیقت نورِ حق تھا سر سے لے کر تا بپا　　واہ رے یکتائی احمد کہ سایہ بھی نہ تھا

ہو نہ جس کا مثل محبوبِ خدا ایسا تو ہو

یوں تو دنیا میں ہوئے پیدا ہزاروں انبیا　　پر ہوا اب تک نہ پھر ہوگا نظیرِ مصطفٰے
آپ کو صانع نے بیشک ایک ہی پیدا کیا　　واہ رے یکتائی احمد کہ سایہ بھی نہ تھا

ہو نہ جس کا مثل محبوبِ خدا ایسا تو ہو

دوستونکی داد کیا اور دوستوں کی کیا پسند　　کیا کہا ہم نے اگر دس پانچ کو آیا پسند
بات ہے وہ واقعی جسکو کرے دنیا پسند　　غل طرفداروں کا مجلس میں ہمیں ہے نا پسند
محو دشمن بھی ہو باتوں میں مزا ایسا تو ہو

میرے مولا ہیں علیؑ مرتضےٰ شیرِ خدا　　جنکے در سے ہوتی ہے شاہوں کی بھی حاجت روا
دو جہاں میں آپ ہیں ہر ایک کے مشکلکشا　　ہوں درِ حیدر کا سائل فخر ہے مجھ کو بجا
شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

اہل دولت سے کہوں کیا اپنے دل کا مدعا　　توبہ توبہ ان سے کیا ہوگی مری حاجت روا
دل غنی ہے گرچہ میں ہوں ایک فقیر بے نوا　　ہوں درِ حیدر کا سائل فخر ہے مجھ کو بجا
شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

ہر صدا پر میری ہو کیوں کر نہ شور مرحبا　　جانتے ہو کون ہوں اور کس کا ہوں مدحت سرا
لیں نہ کیونکر اہل دنیا مجھکو آنکھوں پر بٹھا　　ہوں درِ حیدر کا سائل فخر ہے مجھ کو بجا
شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

ناصبوری سے ہمیشہ چاہیئے انسانکو ننگ　　صبر وہ پیدا کرے جس سے ہوں خاص و عام دنگ
اُف نہ نکلے منہ سے گو جینے سے بھی ہو جائے تنگ　　پیس ڈالے گو زمانہ پر نہ چھوڑے اپنا رنگ
بردباری میں بشر مثلِ حنا ایسا تو ہو

ند اللہ شاہ کا صبر و تحمل وقت جنگ　　　شکر ہی نکلا زبان سے جب کیا اعدا نے تنگ

شاہ فرماتے تھے بے صبری سی ہے انسان کو ننگ　　　پلیس ڈالے گو زمانہ پر نہ چھوڑے اپنا رنگ

بردباری میں بشر مثلِ حنا ایسا تو ہو

ھی وہ ہے کہ جسکی شان میں آیا ھل اتیٰ　　　علم کا ہو جسکے دروازہ علیؑ بابھا

جسکے اشجاع ہونیکی شاہد حدیث لا فتیٰ　　　شیر حق دستِ خدا میر عرب مشکلکشا

یہ لقب جسکے ہوں خویش مصطفےٰ ایسا تو ہو

چشم الفت سی جو ڈالی اک نظر شبیر نے　　　کر دیا اسرار حق سے باخبر شبیر نے

ڈوبتا پکڑا نہ ہوتا ہاتھ اگر شبیر نے　　　جا چکا تھا حُر سوئے دوزخ مگر شبیر نے

راہ جنت کی بتا دی رہنما ایسا تو ہو

مشکل آسان جب علی کے نام سے ہو بالیقیں　　　اسکو کیا مشکل رہے جسکے علی ہوں خود معیں

دشمنونکی مشکلیں بھی آپ نے آسان کیں　　　پیش حیدر آکے رہ جائے گرہ ممکن نہیں

دستِ قاتل کھولدے مشکلکشا ایسا تو ہو

ٹھہرے مشکل جب علی ڈالیں نظر ممکن نہیں　　　کھل نہ جائے عقدہ پیچیدہ یہ ممکن نہیں

واں کریں مشکلکشائی جس جگہ ممکن نہیں　　　پیش حیدر آکے رہ جائے گرہ ممکن نہیں

دستِ قاتل کھولدے مشکلکشا ایسا تو ہو

رن میں سر کٹواتے تھو جا جا کے جب خویش و تبار　　کہتے تھے حضرت کہ تیرا شکر ہے پروردگار

پا چکے جس دم شہادت خود امام باوقار　　بیڑیاں عابد نے پہنیں تا ہو امت رستگار

خلق میں پابندِ تسلیم و رضا ایسا تو ہو

دکھ نئے گو چرخ دیتا ہے وحید زار کو　　سب یہ اے مرزا گوارا ہے وحید زار کو

اپنے مٹ جانیکا کیا غم ہے وحید زار کو　　پیس اے گردوں جو پیسا ہے وحید زار کو

چشم بد بین میں نہ کھٹکے سرمہ سا ایسا تو ہو